ماہنامہ

اشراق

لاہور

مارچ ۲۰۲۵ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 46 سال

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”روزہ ایمان سے پیدا ہونے والے بندگی کے تعلق کا اعلیٰ مظہر ہے۔ بھوک اور پیاس کے اس تجربے کا محرک صرف خدا کی رضا کا حصول ہے۔ رمضان اللہ کی بندگی کا عملی اظہار ہے۔ پورا مہینا ایک رنگ عبادت میں گزرتا ہے۔ قرآن مجید سے لگاؤ بڑھ جاتا ہے۔ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ قرآن سے یہ تعلق شعور ہدایت قوی تر کر دے۔ اطاعت کا یہ تجربہ پوری زندگی کو محیط ہو جائے۔“ —— شذرات

- اپنی بڑائی کا اظہار صرف اُسی کو زیبا ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ اُس کے سوا جو بھی اِس کا اظہار کرے گا، ناحق کرے گا۔ یہ اُس کے سوا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔ (قرآنیات)
- روزہ اور رمضان اللہ کی بندگی اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ اللہ کی کبریائی کا ادراک، اس کے نظام ہدایت پر شکر گزاری کی کیفیت، اس کے حکم پر بھوک اور پیاس کے باوجود اکل و شرب سے رکے رہنا بندگی اور امتثال امر کا بھرپور اظہار ہے۔ (شذرات)
- اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا صلہ اُس نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اِس کے بعد آدمی کے چھوٹے گناہوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف کر دیتا ہے۔ یہ معافی، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو قائم رکھنے ہی سے ہوتی ہے، اور نماز اِسی تعلق کا اولین اظہار ہے۔ (معارف نبوی)
- اگر کوئی شخص ملازمت کرتا ہے تو اسے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ روزے سے ہے تو اسے زیادہ مشقت اٹھا کر لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے۔ جب اس نے معاہدہ کیا ہوا ہے کہ اسے دفتری اوقات میں حاضر ہونا ہے، لوگوں کی خدمت کرنی ہے یا اس کے اوپر ذمہ داریاں ہیں تو اسے ان کو بدرجۂ اتم پورا کرنا چاہیے۔ (یسئلون)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۷ شمارہ ۳ مارچ ۲۰۲۵ء رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات		
روزہ	طالب محسن	۴
قرآنیات		
البیان: حٰم السجدہ ۴۱: ۱۳-۲۴ (۲)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی		
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی	جاوید احمد غامدی / محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز	۱۲
نماز گناہوں کو مٹا دیتی ہے	جاوید احمد غامدی / محسن ممتاز	۲۹
دین و دانش		
زوجین	جاوید احمد غامدی	۳۲
مکالمہ		
مذہب، انسانی فطرت اور تاریخ (۱)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن	۳۴
سیر و سوانح		
السابقون الاولون من الانصار (۳)	محمد وسیم اختر مفتی	۴۰
نقطۂ نظر		
شورائیت اور ملوکیت	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۵۵
اصلاح و دعوت		
کھیتی	معاذ بن نور	۶۱
یسئلون		
روزہ اور رمضان: متفرق احکام	شاہد رضا	۶۴
شخصیات		
حیات امین احسن (۱۸)	محمد بلال	۷۴

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
طالب محسن
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر شہزاد سلیم
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
اظہار احمد
جنید حسن
محمد رفیع مفتی
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر ساجد حمید
آصف افتخار
خورشید احمد ندیم
کوکب شہزاد
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا
نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

شذرات

طالب محسن

روزہ

معبود کی رضا حاصل کرنا معبود کو ماننے والے کی زندگی کا حاصل ہے۔ اس مقصد کے لیے انسان نے اپنے تخلیقی ذہن کی مدد سے کئی طریقے وضع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک چیز ترک خور و نوش ہے۔ دنیا کے مذاہب کا مطالعہ کریں تو اس کی مختلف صورتیں ہمیں ان مذاہب میں بھی نظر آتی ہیں جو انسانوں کی ایجاد ہیں۔

دوسری طرف خدا کے نازل کردہ مذہب کی روایت ہے۔ قرآن مجید جو اللہ کی اتاری ہوئی آخری کتاب ہدایت ہے، یہ بیان کرتی ہے کہ کچھ دنوں اور کچھ اوقات کے لیے ترک خور و نوش، یعنی روزے کی یہ عبادت پہلی امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ. (البقرہ ۲: ۱۸۳)

”ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گیے ہیں، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تھے۔“

قرآن مجید میں روزے کا مقصد بھی بیان ہوا ہے اور اس عبادت کے لیے ماہ رمضان کے مہینے کے تقرر کی حکمت بھی بیان ہوئی ہے۔ روزے کی فرضیت بیان کر کے واضح کیا ہے کہ اس سے مقصود تقویٰ پیدا کرنا ہے:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۳)

”تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔“

دین اللہ کے حدود کی پاس داری اور اللہ کے احکام کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ پاس داری اور پابندی کا حق اسی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے جب بندہ اپنے اندر اللہ کا تقویٰ رکھتا ہو۔ ماہ رمضان کا انتخاب اس لیے ہوا ہے کہ

یہ نزول قرآن کا مہینا ہے۔ قرآن مجید اللہ کی ہدایت کا صحیفہ ہے اور اللہ اور بندے کے مابین اس کی حیثیت ایک عہد کی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا شعور اس عہد کی معنویت کو بندے کے لیے زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔ اللہ کی کبریائی اور اس کی یہ بے پایاں عنایت کہ اس نے بندے کی ہدایت کی احتیاج کو ہر لحاظ سے پورا کر دیا، دل کو شکر سے لبریز کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۵)

”رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے ہدایت اور اس ہدایت کے لیے واضح کر دینے والے دلائل اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ تم میں جو بھی اس مہینے کو پائے وہ اس میں روزے رکھے۔ جو بیمار ہو یا سفر کر رہا ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا تاکہ تم روزوں کی گنتی پوری کر لو اور اللہ نے جو تمھیں ہدایت بخشی ہے، اس پر اس کی کبریائی کرو اور اس کی شکر گزاری کرو۔“

اس آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روزہ اور رمضان اللہ کی بندگی اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ اللہ کی کبریائی کا ادراک، اس کے نظام ہدایت پر شکر گزاری کی کیفیت، اس کے حکم پر بھوک اور پیاس کے باوجود اکل و شرب سے رکے رہنا بندگی اور امتثال امر کا بھرپور اظہار ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی اسی معنویت کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

من صام رمضان إيمانًا واحتسابًا غفر له ما تقدم من ذنبه ومن قام ليلة القدر إيمانًا واحتسابًا غفر له ما تقدم من ذنبه. (مسلم، رقم ۱۷۵)

”جس نے رمضان کے روزے ایمان کے باعث اور اجر کی غرض سے رکھے تو اسے گزرے گناہوں کی معافی مل گئی۔“[۱]

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن مجید میں بیان کیے گئے معافی کے ضابطے ہی کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جو کبیرہ گناہوں سے مجتنب رہتا ہے، اس کی برائیاں مٹا دی جائیں گی۔ دیکھیے النساء ۴: ۳۱۔

روزہ ایمان سے پیدا ہونے والے بندگی کے تعلق کا اعلیٰ مظہر ہے۔ بھوک اور پیاس کے اس تجربے کا محرک صرف خدا کی رضا کا حصول ہے۔

رمضان اللہ کی بندگی کا عملی اظہار ہے۔ پورا مہینا ایک رنگ عبادت میں گزرتا ہے۔ قرآن مجید سے لگاؤ بڑھ جاتا ہے۔ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ قرآن سے یہ تعلق شعور ہدایت قوی تر کر دے۔ اطاعت کا یہ تجربہ پوری زندگی کو محیط ہو جائے۔

> ''روزے کا مقصد قرآن مجید نے سورۂ بقرہ... میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ اِس کے لیے اصل میں 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔'' (جاوید احمد غامدی، میزان ۳۶۳)

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ حٰم السجدۃ

(۲)

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿١٣﴾ ط
اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط

اب بھی اگر منہ موڑتے ہیں تو کہہ دو کہ جیسی کڑک عاد و ثمود پر ہوئی تھی،[۱۹] میں تم کو اُسی طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں، جب اُن کے آگے اور پیچھے سے[۲۰] اُن کے رسول اُن کے پاس آئے

۱۹۔ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ہود علیہ السلام اِنھی کی طرف بھیجے گئے تھے۔ ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ چنانچہ اِنھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اِن کی طرف حضرت صالح کی بعثت ہوئی۔ دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ اِن قوموں پر جو عذاب آیا، اُس میں شمال کی تند ہوائیں، ژالہ باری اور رعد و برق، سب جمع ہو گئے تھے۔ قرآن اِسی بنا پر اُسے کبھی ایک اور کبھی دوسری چیز سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں اُس کے ایک نمایاں وصف 'صٰعِقَة' سے اُس کا ذکر فرمایا ہے۔

۲۰۔ یہ وہی تعبیر ہے جو ابلیس نے اپنے چیلنج میں اختیار کی تھی کہ میں آگے اور پیچھے سے اُن کو گھیروں گا، یعنی ہر طرف سے اُن پر حملہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے لیے اِسی تعبیر کو اختیار کر کے واضح فرمایا کہ

قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾
فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ
اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا
يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيۡقَهُمۡ

کہ اُنھیں ہر پہلو سے سمجھا دیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا رب چاہتا کہ کسی کو رسول بنا کر بھیجے تو فرشتے اتارتا، اِس لیے ہم تو اُس پیغام کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔[۲۱] ۱۳-۱۴

سو عاد کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی حق کے[۲۲] زمین میں بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے کہ ہم سے بڑھ کر طاقت میں کون ہے! کیا اُنھوں نے سوچا نہیں کہ جس خدا نے اُن کو پیدا کیا ہے، وہ اُن سے طاقت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے؟ (اِس طرح بڑے بن بیٹھے) اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔ سو ہم نے نحوست کے چند دنوں میں[۲۳] اُن پر سرما کی تند ہوا[۲۴] بھیج دی تاکہ اُن کو

ابلیس کے فتنوں سے بچانے کے لیے وہ بھی اِسی طرح آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آکر انتھک، ہمہ جہت اور شبانہ روز جاں فشانی کے ساتھ اپنے مخاطبین کو سمجھاتے رہے۔

۲۱۔ اِس اسلوب میں جو طنز ہے، وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اُن کا مطلب یہ تھا کہ آپ لوگ بزعم خویش جس پیغام کے حامل بن کر آئے ہو، ہمیں اُس سے صاف انکار ہے، یعنی نہ ہم آپ لوگوں کو رسول مانتے اور نہ آپ لوگوں کے پیغام کو پیغام۔ اِس وجہ سے ہم پر اِس قسم کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۹۱)

۲۲۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اپنی بڑائی کا اظہار صرف اُسی کو زیبا ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ اُس کے سوا جو بھی اِس کا اظہار کرے گا، ناحق کرے گا۔ یہ اُس کے سوا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔

۲۳۔ یعنی جب سردی کی شدت سے ہر چیز پر اداسی، افسردگی اور نحوست چھائی ہوئی تھی۔

عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا
يُنْصَرُوْنَ ﴿١٦﴾
وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ
الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٧﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾
وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا

اِسی دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب[۲۵] چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں زیادہ رسوا کر دینے والا ہو گا اور وہاں اُن کو کوئی مدد بھی نہیں پہنچے گی۔[۲۶] ۱۵-۱۶

رہے ثمود تو ہم نے اُن کو بھی ہدایت کی راہ دکھائی، مگر اُنھوں نے ہدایت پر اندھا بن کر رہنے کو ترجیح دی۔ سو اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کو ذلت کے عذاب کی کڑک نے آدبوچا اور ہم نے اُن کو بچا لیا جو ایمان لائے اور ہم سے ڈرنے والے تھے۔ ۱۷-۱۸

اُس دن کا خیال کرو، جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف ہانک کر اکٹھے کیے جائیں گے۔[۲۷] پھر (اِن کے اعمال کے لحاظ سے) اِن کی درجہ بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ وقت

۲۴۔ یہ عرب میں شمال سے چلتی تھی اور اِس کے ساتھ سرما کے بادل بھی ہوتے تھے اور گرج چمک بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی کو انتہا تک پہنچا کر اُن کے لیے عذاب بنا دیا۔

۲۵۔ یعنی ایسا عذاب جو اُن کو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں نمونۂ عبرت بنا دے۔ یہ، ظاہر ہے کہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوا جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

۲۶۔ یعنی نہ اُن کے دیوی دیوتا کچھ کام آئیں گے اور نہ اُن کی قوت و جمعیت، جس پر دنیا میں نازاں رہے۔

۲۷۔ آیت میں 'يُحْشَرُ' کے بعد 'اِلٰی' ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'يُسَاقُوْنَ' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔

شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۰﴾
وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ
شَىۡءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۱﴾

آجائے گا کہ دوزخ تک آپہنچیں گے تو جو کچھ یہ کرتے رہے، اِن کے کان اور اِن کی آنکھیں اور اِن کے جسم کے رونگٹے[۲۸] اِن پر اُس کی گواہی دیں گے۔ یہ اپنے جسموں سے پوچھیں گے: تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے: ہم کو اُسی اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔ (اِس طرح گواہی دیں گے اور لوگو، یہ بات بھی یاد رکھو کہ) اُسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف لوٹائے جا رہے ہو۔[۲۹] ۱۹-۲۱

۲۸۔ یہ احاطے کے لیے ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ آدمی کے جسم کا روآں روآں اُس دن گواہی کے لیے زبان بن جائے گا۔ یہ، اگرچہ یہاں بھی بنا ہوا ہے، لیکن اِس کو سنتے وہی ہیں جن کے دل شنوا ہیں۔

۲۹۔ یہ جملہ 'جُلُوۡد' کے جواب کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اِس کا عطف اصل سلسلۂ کلام پر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... 'جُلُوۡد' سے سوال اور اُن کے جواب کا ذکر بیچ میں بطور جملۂ معترضہ آگیا ہے۔ اصل بات جو اوپر فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اُس دن اُن کے کان، آنکھ اور اُن کے دوسرے تمام اعضا اُن کے خلاف گواہی دیں گے اور مقصود اِس سے اِس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ آدمی کے اپنے ہی اعضا اُس کے سارے راز کھول دینے کے لیے ناطق ہو جائیں گے تو کسی اور کی گواہی اور شہادت و شفاعت اُس کے لیے کیا نافع ہو سکے گی؟ مدعی کی اپنی گواہی تو لاکھوں کی گواہی پر بھاری ہو سکتی ہے۔ اِسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ "اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اُسی نے تم کو اول بار پیدا کیا ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"۔ یعنی اگر تم نے یہ امید باندھ رکھی ہے کہ تمھاری واپسی تمھارے اِن مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کی طرف ہو گی، جن کی تم پرستش کرتے ہو تو یہ خیال محض وہم پر مبنی ہے۔ جن کو خلق و تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے، آخر وہ مولیٰ و مرجع کس طرح بن جائیں گے!" (تدبر قرآن ۷/ ۹۴)

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ
وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾
وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾
فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾

تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے[۳۰] کہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسموں کے رونگٹے تمھارے خلاف گواہی دیں گے، بلکہ تم نے تو گمان کر رکھا تھا کہ اللہ بھی اُن بہت سی چیزوں سے واقف نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ تمھارا یہی گمان ہے جو تم نے اپنے پروردگار کے بارے میں کیا تھا، جس نے تم کو غارت کیا اور تم خسارے میں پڑ گئے۔ ۲۲-۲۳

سو اگر یہ صبر کریں، تب بھی دوزخ ہی اِن کا ٹھکانا ہے اور اگر نہ کریں، تب بھی۔ اور اگر یہ معافی چاہیں گے تو اِنھیں معافی بھی نہیں دی جائے گی۔ ۲۴

۳۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ' (تم چھپتے نہیں تھے)۔ یہ، ظاہر ہے کہ اِسی لیے کہ اُنھیں اپنے اعضا سے اپنے خلاف کسی گواہی کا اندیشہ نہیں تھا۔ یہ لازم سے ملزوم پر استدلال کا اسلوب ہے۔ ترجمہ اِسی رعایت سے کیا گیا ہے۔

[باقی]

سیرۃ النبی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی

— ۱ —

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّهَا قَالَتْ:[۱] أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لاَ يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، [ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ][۲]، فَكَانَ يَأْتِي حِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ– وَهُوَ التَّعَبُّدُ– اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَتُزَوِّدُهُ لِمِثْلِهَا، حَتَّى فَجِئَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فِيهِ فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: اقْرَأْ. فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ.

فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ اقْرَأْ. فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ. فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: ﴿**اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ**﴾[۳]». فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهُ حَتَّى دَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ فَقَالَ: «زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي»، فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ: «يَا خَدِيجَةُ، مَا لِي»؟ وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ وَقَالَ: «قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي» . فَقَالَتْ لَهُ: كَلَّا أَبْشِرْ، فَوَاللهِ لاَ يُخْزِيكَ اللهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، [وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ][۴]، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ. ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزَّى بْنِ قُصَيٍّ- وَهْوَ ابْنُ عَمِّ خَدِيجَةَ أَخِي أَبِيهَا، وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ فَيَكْتُبُ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنَ الإِنْجِيلِ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكْتُبَ،[۵] وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا، قَدْ عَمِيَ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ أَيِ ابْنَ عَمِّ، اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ. فَقَالَ وَرَقَةُ: ابْنَ أَخِي، مَاذَا تَرَى؟ فَأَخْبَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَأَى، فَقَالَ وَرَقَةُ: هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُوسَى، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا، أَكُونُ حَيًّا، حِينَ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ»؟ فَقَالَ وَرَقَةُ: نَعَمْ، لَمْ يَأْتِ

رَجُلٌ قَطُّ بِمَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا. ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ، وَفَتَرَ الْوَحْيُ فَتْرَةً.

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا نیند میں سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے، اُس کی تاویل روشن صبح کی طرح ظاہر ہو جاتی۔ تب آپ کو تنہائی بھانے لگی اور آپ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر کئی کئی دنوں کے لیے غار حرا میں خلوت گزیں ہو جایا کرتے تھے۔[1] وہاں آپ 'تحنث'[2]، یعنی دین حنیفی کی عبادت میں مشغول رہتے اور پھر (توشہ ختم ہونے پر) خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور وہ آپ کے لیے اتنا ہی توشہ مزید تیار کر دیتی تھیں۔ (آپ کی خلوت گزینی کا یہ سلسلہ اِسی طرح چلتا رہا)، یہاں تک کہ (ایک دن) جب آپ غار حرا میں تھے، حق آپ پر اچانک ظاہر ہوا، اللہ کا فرشتہ (جبریل) آپ کے پاس آیا اور کہا: (اے محمد)، پڑھو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اُس سے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اِس پر اُس نے مجھے پکڑا اور زور سے بھینچا، جس کی وجہ سے مجھ کو بہت تکلیف ہوئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے مجھے دوبارہ پکڑا اور بھینچا، یہاں تک کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو تو میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اِس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور اتنے زور سے بھینچا کہ میں بے بس ہو گیا، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾، ''(اِنھیں) پڑھ (کر سناؤ)، (اے پیغمبر)، اپنے اُس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے، جمے ہوئے خون (جیسے ایک لوتھڑے) سے انسان کو پیدا کیا ہے۔ (اِنھیں) پڑھ (کر سناؤ)، اور حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے (یہ قرآن) سکھایا۔ انسان کو (اِس میں) وہ علم دیا،

جسے وہ نہیں جانتا تھا۔‘‘[3] (راوی بتاتے ہیں کہ) پھر ان آیات کے ساتھ[4] آپ کانپتے لرزتے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور آپ نے فرمایا: مجھے چادر اڑھادو، مجھے چادر اڑھادو۔ چنانچہ گھر والوں نے آپ کو چادر اڑھادی، حتیٰ کہ آپ کا خوف دور ہو گیا تو آپ نے فرمایا: اے خدیجہ مجھے کیا ہوا ہے، پھر آپ نے اپنا سارا حال اُن سے بیان کیا اور کہا: مجھے تو اب اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے۔[5] سیدہ خدیجہ نے آپ سے کہا: بخدا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، آپ خوش ہو جائیے، اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا، آپ تو کنبہ پرور ہیں، صادق اللسان ہیں، بے کسوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، مفلسوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور لوگوں پر راہ حق میں آنے والی مصیبتوں میں اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔[6] پھر (مزید تسلی کے لیے) خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی کے پاس لے گئیں۔[7] یہ اُن کے چچازاد بھائی تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے اور عربی میں کتابت کیا کرتے تھے۔ خدا کو جب تک منظور تھا، یہ عربی زبان میں انجیل کی کتابت کرتے رہے تھے۔ اب یہ عمر رسیدہ تھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ سیدہ خدیجہ نے اُن سے کہا: اے میرے چچازاد بھائی، اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔ ورقہ نے آپ سے پوچھا: بھتیجے، تو نے کیا دیکھا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دیکھا تھا، اُنھیں بتایا۔ ورقہ نے کہا: یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اے کاش، میں آپ کے اِس عہد نبوت میں جوان ہوتا اور اُس وقت زندہ ہوتا، جب آپ کی قوم آپ کو (اس شہر سے) نکال دے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر (تعجب سے) پوچھا: کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں، کوئی بھی شخص جو آپ کی طرح (امر حق) لے کر آیا ہے، اُس سے دشمنی ہی کی گئی ہے۔ اگر مجھے آپ کا دور نبوت مل گیا تو میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔[8] پھر (ہوا یہ کہ) جلد ہی ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کچھ عرصہ کے لیے رُک گئی۔

۱۔ یہ غالباً کسی رمضان کا ذکر ہے۔ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں

اعتکاف کے لیے اِسی غار میں جاتے تھے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو گی کہ بیت اللہ میں بت رکھ دینے کی وجہ سے دین حنیف کے پیرو خلوت کی اِس عبادت کے لیے کئی دن تک شب و روز بتوں اور اُن کی پرستش کے لیے آنے والوں کے شور و غوغا میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ یہاں جس چیز کو 'خلوت گزینی' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ وہی اعتکاف کی خلوت گزینی ہے، جو دین حق کی عبادات میں ہمیشہ شامل رہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ہر سال اِس کا اہتمام کرتے اور اِس موقع پر جو غربا اور مساکین وہاں آجاتے، اُن کو کھانا بھی کھلاتے تھے۔ اپنے دادا کی یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی طرح قائم رکھی۔ چنانچہ روایتوں میں ہے کہ اعتکاف سے اٹھنے کے بعد آپ سب سے پہلے بیت اللہ میں حاضر ہوتے اور اُس کا طواف کرتے تھے (تفصیلات کے لیے دیکھیے: ابن ہشام ۱/ ۲۲۷۔ فتح الباری، ابن حجر ۱۲/ ۳۵۵۔ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۲۴/ ۱۲۸۔ البحر المحیط الثجاج فی شرح صحیح الامام مسلم بن الحجاج، محمد بن علی بن آدم ۴/ ۳۶۰)۔

۲۔ یہ درحقیقت 'تحنف' ہے، جس میں 'ف' 'ث' سے تبدیل ہو گئی ہے۔ 'جدف' سے 'جدث' اور 'فم' سے 'ثم' اِسی کی مثالیں ہیں۔ اِس سے مراد حنیفیت ہے، جس سے اہل عرب بالعموم دین ابراہیمی کی روایت کو تعبیر کرتے تھے۔

۳۔ یہ نزول قرآن کی ابتدا نہیں ہے، بلکہ آپ کا رؤیا ہے، جس میں ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق ریشم کے غلاف میں ایک کتاب آپ کو دکھائی گئی۔ اُس میں سورۂ علق کی یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اُن کا بیان ہے کہ اِس کے بعد آپ نیند سے بیدار ہو کر باہر نکلے اور پہاڑ کے درمیان میں پہنچے تو پہلی مرتبہ جبریل امین کو دیکھا۔ یہ وہی ملاقات ہے، جس کا ذکر سورۂ نجم (۵۳) میں ہے۔ اِسی ملاقات میں آپ کو بتایا گیا کہ آپ کو رسالت کے لیے منتخب کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: ابن ہشام ۱/ ۲۲۹)۔ قرآن مجید کا نزول اِس کے بعد کسی وقت شروع ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ علق کی یہ آیات بھی نزول کے لحاظ سے قرآن کی پہلی آیات نہیں ہیں۔

۴۔ یہ راوی کی غلطی ہے۔ سورۂ علق کی آیات، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے، باہر نکلنے سے پہلے آپ اپنے رؤیا میں دیکھ چکے تھے۔ ابن اسحٰق میں صراحت ہے کہ سیدہ خدیجہ غار حرا کے اعتکاف میں اُسی جگہ آپ کے ساتھ موجود تھیں۔ اُنھوں نے وہیں سے کچھ لوگ آپ کی تلاش میں پیچھے بھیجے، لیکن آپ اُن کو نہیں ملے۔ چنانچہ وہ مکہ کے اوپر کے حصے میں آپ کو ڈھونڈ کر واپس آگئے۔ اِس کے بعد کسی وقت آپ پہاڑ کے درمیان سے لوٹے اور سیدہ خدیجہ کے ساتھ وہ گفتگو ہوئی، جو آگے نقل ہوئی ہے (ابن ہشام ۱/ ۲۲۹)۔

۵۔ اِس تاثر کے نقل کرنے میں بھی راویوں سے کچھ غلطی ہوئی ہے۔ آپ نے یہ بات غالباً ورقہ بن نوفل سے ملاقات کے بعد اور اُس ردعمل کے حوالے سے کہی ہے جو قوم کی طرف سے آپ کی دعوت کے جواب میں ہو سکتا تھا۔ وحی و نبوت کے تجربے سے اِس کا، ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۔ قرآن کا بیان ہے کہ پیغمبر 'خیار الناس' ہوتے ہیں۔ یہ اُس کی بہترین تصویر ہے، جو سیدہ خدیجہ نے اِن الفاظ میں کھینچ دی ہے۔

۷۔ ابن اسحٰق میں صراحت ہے کہ سیدہ آپ کو ساتھ لے کر نہیں، بلکہ تنہا اور اپنی تسلی کے لیے ورقہ بن نوفل کے پاس گئی تھیں، اور اُن سے ملاقات کے بعد وہیں غار میں واپس آکر آپ کو بتایا تھا کہ اُنھوں نے کہا ہے: خدیجہ، اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو بے شک، یہ وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا اور بے شک، وہ اِس امت کے نبی ہیں۔ تم اُن سے جا کر کہو کہ ثابت قدم رہیں (ابن ہشام ۱/ ۲۲۹)۔

۸۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ اپنا اعتکاف پورا کر لینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ واپس آئے اور اپنے معمول کے مطابق گھر جانے سے پہلے بیت اللہ میں طواف کے لیے تشریف لے گئے تو جبریل امین سے ملاقات کے بعد پہلی مرتبہ ورقہ بن نوفل وہیں آپ سے ملے اور پوچھا: بھتیجے، مجھے بتائیے، آپ نے کیا دیکھا اور کیا سنا ہے؟ آپ نے بتایا تو اُنھوں نے کہا: اُس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، بے شک تم اِس امت کے نبی ہو، تمھارے پاس وہی ناموس اکبر آیا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ اُنھوں نے مزید کہا: بے شک، یہ لوگ تمھیں جھٹلائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے اور تم سے لڑیں گے اور تمھیں نکال دیں گے۔ میں اُس دن تک زندہ رہا تو ضرور خدا کے دین کی مدد کروں گا۔ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ اُس کے بعد ورقہ نے آپ کے سر کو بوسہ دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اپنے گھر تشریف لے گئے (ابن ہشام ۱/ ۲۲۹)۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۶۹۸۲ سے لیا گیا ہے۔ اِس کی راوی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اِس کے متابعات درج ذیل کتب میں منقول ہیں:

مصنف عبدالرزاق، رقم ۹۷۱۹۔ مسند اسحٰق بن راہویہ، رقم ۸۴۰۔ مسند احمد، رقم ۲۵۹۵۹۔ صحیح بخاری، رقم ۳، ۴۶۷۰، ۴۹۵۳۔ صحیح مسلم، رقم ۱۶۰۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۲۸۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۸۴۳۔ الایمان،

ابن مندہ، رقم ۶۸۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۲۱۔

۲۔ بعض روایات، مثلاً صحیح بخاری، رقم ۳ میں اِس جگہ 'الصادقة' کے بجاے 'الصالحة' ''اچھے'' کا لفظ آیا ہے۔

۳۔ العلق ۹۶: ۱-۵۔

۴۔ صحیح بخاری، رقم ۳۔

۵۔ بعض روایات مثلاً، صحیح بخاری، رقم ۳ میں اِس جگہ 'وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ فَيَكْتُبُ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنَ الإِنْجِيلِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَكْتُبَ' کے بجاے 'وَكَانَ يَكْتُبُ الكِتَابَ العِبْرَانِيَّ، فَيَكْتُبُ مِنَ الإِنْجِيلِ بِالعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَكْتُبَ' ''یہ عبرانی میں کتابت کرتے تھے، خدا نے جب تک چاہا، یہ انجیل کی عبرانی میں کتابت کرتے رہے تھے'' کے الفاظ ہیں۔

— ۲ —

عَنْ يَحْيَى، يَقُولُ:[1] سَأَلْتُ أَبَا سَلَمَةَ أَيُّ الْقُرْآنِ أُنْزِلَ قَبْلُ؟ قَالَ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾، فَقُلْتُ: أَوِ اقْرَأْ؟ فَقَالَ: سَأَلْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ أَيُّ الْقُرْآنِ أُنْزِلَ قَبْلُ؟ قَالَ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾، فَقُلْتُ: أَوِ اقْرَأْ؟ قَالَ جَابِرٌ: أُحَدِّثُكُمْ مَا حَدَّثَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ [وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ][2] قَالَ: «جَاوَرْتُ بِحِرَاءٍ شَهْرًا، (و) [فَتَرَ عَنِّي الْوَحْيُ فَتْرَةً][3]، فَلَمَّا قَضَيْتُ جِوَارِي نَزَلْتُ فَاسْتَبْطَنْتُ بَطْنَ الْوَادِي، فَنُودِيتُ فَنَظَرْتُ أَمَامِي وَخَلْفِي، وَعَنْ يَمِينِي، وَعَنْ شِمَالِي، فَلَمْ أَرَ أَحَدًا، ثُمَّ نُودِيتُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ أَرَ أَحَدًا، ثُمَّ نُودِيتُ فَرَفَعْتُ [بَصَرِي إِلَى السَّمَاءِ فَإِذَا الْمَلَكُ][4] الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ، قَاعِدٌ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ

السَّمَاءِ وَالأَرْضِ] [5] فَأَخَذَتْنِي رَجْفَةٌ شَدِيدَةٌ، فَأَتَيْتُ خَدِيجَةَ، فَقُلْتُ: دَثِّرُونِي، فَدَثَّرُونِي، فَصَبُّوا عَلَيَّ مَاءً، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَآأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ [6]، ثُمَّ تَتَابَعَ الْوَحْيُ».

یحییٰ ابن کثیر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے ابو سلمہ سے پوچھا: قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا تھا؟ انھوں نے کہا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾۔ میں نے پھر پوچھا: 'اَلْمُدَّثِّرُ' یا 'اِقْرَاْ'؟ اُنھوں نے کہا: میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا تھا تو اُنھوں نے جواب دیا تھا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾۔ میں نے (بھی اُن سے) پھر یہی پوچھا تھا کہ 'اَلْمُدَّثِّرُ' یا 'اِقْرَاْ'؟ جابر رضی اللہ عنہ نے اِس پر مجھ سے کہا تھا کہ (میں نے اِس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کچھ نہیں سنا، البتہ) میں تمھیں وہ بات بتاتا ہوں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں وقفہ آجانے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ہم سے بیان کی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا: میں نے حرا پر ایک ماہ کا اعتکاف کیا، جب کہ وحی کا سلسلہ کچھ رُکا ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اپنا اعتکاف مکمل کر لیا اور میں جبل حرا سے نیچے اترا اور وادی میں پہنچا تو (اچانک) مجھے پکارا گیا، میں نے آگے اور پیچھے دیکھا، دائیں اور بائیں دیکھا، لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ مجھے دوبارہ آواز دی گئی اور میں نے پھر دیکھا، مگر اب بھی مجھے کوئی نظر نہیں آیا، پھر (تیسری مرتبہ) مجھے آواز آئی تو میں نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی، کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا، وہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔[1] (اُس کی یہ عظمت دیکھ کر) مجھ پر سخت لرزہ طاری ہو گیا۔ میں فوراً خدیجہ کے پاس آیا اور گھر والوں سے کہا: مجھے چادر اڑھا دو، مجھے چادر اڑھا دو۔ اُنھوں نے مجھے چادر اڑھا دی، پھر انھوں نے مجھ پر پانی ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اُس کے بعد نازل فرمائیں: ''اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ اور ڈرا، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر

اور اپنے دامن دل کو (شرک کی آلودگی سے) پاک رکھ۔“ (راوی بتاتے ہیں کہ) اِس کے بعد (وقفہ ختم ہو گیا اور) وحی تسلسل کے ساتھ آنے لگی۔[۲]

۱۔ یہ رؤیا میں جبریل امین کو دیکھنے کے بعد اصلی صورت میں اُن کو دیکھنے کا پہلا واقعہ ہے، جس کی تفصیلات پیچھے بیان ہو چکی ہیں۔ سورۂ مدثر کے نزول سے پہلے آپ نے دوسری مرتبہ اُن کو اِسی طرح دیکھا۔ اِس کا ذکر سورۂ نجم (۵۳) میں دیکھنا چاہیے۔ وہاں صراحت ہے کہ اِس مرتبہ آپ نے اُنھیں ’سدرۃ المنتہیٰ‘ کے پاس دیکھا، جب کہ سدرہ پر چھا رہا تھا، جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راویوں کے تصرفات بات کو کس طرح کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔

۲۔ روایتوں میں واقعات جس طرح بعض اوقات خلط ملط ہو جاتے ہیں، یہ پوری روایت اُس کی ایک مثال ہے۔ قرآن مجید کا تدبر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اُس کے نزول کی ابتدا سورۂ فاتحہ سے ہوئی۔ بعض روایتوں سے بھی اِسی کی تائید ہوتی ہے۔ اِس کے بعد مرحلۂ انذار کی سورتیں —— ’الملک‘، ’القلم‘، ’الحاقۃ‘، ’المعارج‘، ’نوح‘ اور ’الجن‘ —— نازل کی گئیں۔ اِن کے بعد سورۂ مزمل نازل ہوئی، جس میں آپ کو ہدایت کی گئی کہ تہجد کا اہتمام کریں اور مرحلۂ انذار عام کے لیے تیار ہو جائیں۔ وحی میں جس وقفے کا ذکر روایت میں ہوا ہے، وہ اِس کے بعد آیا اور آپ نے حرا کے پہاڑ پر کھڑے ہوئے جبریل امین کو دوسری مرتبہ کھلی آنکھوں کے ساتھ اور اُن کی اصل صورت میں ’سدرۃ المنتہیٰ‘ کے پاس دیکھا۔ سورۂ نجم (۵۳) کی آیت ۱۳ میں ’وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً اُخۡرٰی‘ (اور اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھا ہے) کے الفاظ اِسی ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ سورۂ مدثر اِس کے بعد نازل ہوئی اور وحی کا جو سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہوا تھا، وہ حسب سابق بحال ہو گیا۔ اِس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ نزول قرآن کے اِس دوسرے مرحلے میں جو پہلی سورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، وہ سورۂ مدثر ہی ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً صحیح مسلم، رقم ۱۶۱ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی یحییٰ بن ابی کثیر ہیں جو ابو سلمہ سے اور وہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں۔ اِس کے متابعات درج ذیل کتب میں

منقول ہیں:

تفسیر القرآن، عبدالرزاق، رقم، ۳۲۸۰، ۳۳۷۷۔ مسند طیالسی، رقم ۱۷۹۳، ۱۷۹۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۶۵۵۸۔ مسند احمد، رقم ۱۴۴۸۳، ۱۴۵۲۳، ۱۵۰۳۳، ۱۵۰۳۵، ۱۵۲۱۴۔ صحیح بخاری، رقم ۳۲۳۸، ۴۹۲۲، ۴۹۲۴، ۴۹۲۶، ۶۲۱۴۔ سنن ترمذی، رقم ۳۳۲۵۔ الاوائل، ابن ابی عاصم، رقم ۲۹۔ فضائل القران، ابن ضریس، رقم ۲۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۵۶۷، ۱۱۵۶۸، ۱۱۵۶۹۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۲۲۲۵۔ حدیث السراج، رقم ۲۲۱۳۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۳۲، ۳۳۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۴، ۳۵۔ الشریعۃ، آجری، رقم ۹۷۰۔ الاوائل، طبرانی، رقم ۱۷۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۶۸۴، ۶۸۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۹۹۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۲۲۔ دلائل النبوہ، بیہقی ۱۳۸/۲۔

۲۔ صحیح مسلم، رقم ۱۶۱۔

۳۔ صحیح بخاری، رقم ۳۲۳۸۔

۴۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۱۹۴۸ میں 'الملك' کی وضاحت 'مُبَشِّرٌ يَعْنِي جِبْرِيلَ' "بشارت دینے والا، مراد ہے جبریل" کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

۵۔ صحیح بخاری، رقم ۶۲۱۴۔

۶۔ المدثر ۷۴: ۱-۵۔

— ۳ —

عَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ:[۱] اشْتَكَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَقُمْ لَيْلَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ: يَا مُحَمَّدُ، إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ شَيْطَانُكَ قَدْ تَرَكَكَ لَمْ أَرَهُ قَرِبَكَ مُنْذُ لَيْلَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةٍ[۲] فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿**وَالضُّحٰى. وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى. مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى**﴾[۳].

جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ایک موقع پر بیمار ہو گئے اور دو یا تین راتوں میں (تہجد کے لیے) نہیں اٹھ سکے۔ اِس کے بعد ایک عورت آئی اور کہنے لگی: اے محمد، مجھے تو لگتا ہے کہ تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، دو تین راتوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ تمھارے پاس نہیں آیا۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ''دن گواہی دیتا ہے، جب وہ روشن ہو؛ اور رات بھی، جب وہ پر سکون ہو جائے کہ تمھارے پروردگار نے تمھیں چھوڑا ہے، نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔''[1]

۱۔ یہ محض قیاس ہے کہ سورۂ ضحیٰ اِس موقع پر نازل کی گئی تھی۔ 'مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی' کے الفاظ کا صحیح محل کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اُس کو واضح فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہوا کہ اِس وقت اگر تم مخالفوں کی مخالفت، اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کی جتنی ضرورت محسوس کر رہے ہو، اتنی تمھیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اِس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب تمھارے رب نے تمھیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بیزار ہو گیا ہے، بلکہ یہ تمھاری تربیت کے لیے تمھارا امتحان ہے تا کہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔'' (۴۱۳/۹)

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۴۹۵۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ ہیں۔ اِس کے متابعات یہ ہیں:

مسند ابی داؤد طیالسی، رقم ۹۷۷۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۳۶۳۶۔ مسند حمیدی، رقم ۷۹۵۔ مسند احمد، رقم ۱۸۷۹۶، ۱۸۸۰۱، ۱۸۸۰۴، ۱۸۸۰۶۔ صحیح بخاری، رقم ۱۱۲۵، ۴۹۵۰، ۴۹۵۱، ۴۹۸۳۔ صحیح مسلم، رقم ۱۷۹۷۔ سنن ترمذی، رقم ۳۳۴۵۔ الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۲۵۳۳۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۶۱۷۔ مسند رویانی، رقم ۹۶۶۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۹۶۷، ۳۹۶۹، ۶۹۱۰، ۶۹۱۱، ۶۹۱۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۵۶۵، ۶۵۶۶۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۲۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۴۷۲۰، ۴۷۲۱۔ دلائل النبوہ، بیہقی ۷/ ۵۸۔

۲۔ بعض روایات، مثلاً صحیح مسلم، رقم ۱۷۹۷ میں 'اشْتَكَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ

يَقُمْ لَيْلَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ: يَا مُحَمَّدُ، إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ شَيْطَانُكَ قَدْ تَرَكَكَ لَمْ أَرَهُ قَرِبَكَ مُنْذُ لَيْلَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةٍ' کے بجاے 'أَبْطَأَ جِبْرِيلُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ الْمُشْرِكُونَ: قَدْ وُدِّعَ مُحَمَّدٌ'، ''ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام کی آمد میں تاخیر ہوئی، تو مشرکین کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (اُن کے رب کی جانب سے) چھوڑ دیا گیا ہے'' کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۳۔ الضحیٰ ۹۳: ۱-۳۔

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶م). **العلل**. ط ۱. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (۱۲۷۱ھ/۱۹۵۲م). **الجرح والتعديل**. ط ۱. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي شيبة عبد الله بن محمد. (۱۴۰۹ھ). **المصنف في الأحاديث والآثار**. ط ۱. تحقيق: كمال يوسف الحوت. الرياض: مكتبة الرشد.

ابن أبي عاصم أحمد بن عمرو الشيباني. **الأوائل لابن أبي عاصم**. المحقق: محمد بن ناصر العجمي. الكويت. دار الخلفاء للكتاب الإسلامي.

ابن أبي عاصم أحمد بن عمرو. (۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱م). **الآحاد والمثاني**. ط۱. تحقيق: د. باسم فيصل أحمد الجوابرة. الرياض: دار الراية.

ابن حبان محمد بن حبان. (۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰م). **المجروحين من المحدثين**. ط۱. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

إبن حبان، محمد بن حبان البُستي. (۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳م). **صحيح ابن حبان**. ط۲. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶م). **لسان الميزان**. ط ۳. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن راهويه إسحٰق بن إبراهيم المروزي. (١٤١٢هـ/١٩٩١م). **مسند إسحٰق بن راهويه**. ط١. تحقيق: د. عبد الغفور بن عبد الحق البلوشي. المدينة المنورة: مكتبة الإيمان.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن الضريس أبو عبد الله محمد بن أيوب البجلي. (١٤٠٨هـ/١٩٨٧م). **فضائل القرآن وما أنزل من القرآن بمكة وما أنزل بالمدينة**. ط١. تحقيق: غزوة بدير. دار الفكر، دمشق.

ابن عدي عبدالله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

ابن منده محمد بن إسحٰق. (١٤٠٦هـ). **الإيمان**. ط٢. تحقيق: د. علي بن محمد بن ناصر الفقيهي.

بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن هشام عبد الملك بن هشام. (١٣٧٥هـ/١٩٥٥م). **السيرة النبوية**. ط ٢. تحقيق: مصطفى السقا وإبراهيم الأبياري وعبد الحفيظ الشلبي. شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي.

أبو اسحٰق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو عوانة يعقوب بن إسحٰق. (١٤١٩هـ/١٩٩٨م). **المستخرج**. ط١. تحقيق: أيمن بن عارف الدمشقي. بيروت: دار المعرفة.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة**. ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أبو يعلى أحمد بن علي. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **مسند أبي يعلى**. ط ١. تحقيق: حسين سليم أسد. دمشق: دار المأمون للتراث.

الآجُرِّيُّ محمد بن الحسين. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الشريعة**. ط ٢. تحقيق: الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي. الرياض: دار الوطن.

أحمد بن محمد بن حنبل. (١٤١٦هـ/١٩٩٥م). **مسند أحمد**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد، وآخرون. إشراف: د. عبد الله بن عبد المحسن التركي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د. وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د. وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

الأزرقي أبو الوليد محمد بن عبد الله. (١٩٧٦ء). **أخبار مكة وما جاء فيها من الآثار**. **تحقيق**: رشدي الصالح ملحس. دار الأندلس. بيروت.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الجامع الصحيح**. ط٣. تحقيق: مصطفي ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة. دار الوعي مكتبة دار التراث.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبري**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. تحقيق: وثق أصوله وخرج أحاديثه وعلق عليه: الدكتور عبد المعطى قلعجى. القاهرة: دار الريان للتراث. بيروت: دار الكتب العلمية.

الترمذي محمد بن عيسى. (١٣٩٥هـ/١٩٧٥م). **سنن الترمذي**. ط ٢. تحقيق وتعليق: أحمد محمد شاكر (ج١، ٢) ومحمد فؤاد عبد الباقي (ج٣) وإبراهيم عطوة عوض المدرس في الأزهر الشريف (ج٤، ٥). مصر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي.

الحاكم محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع. (١٤١١هـ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١. تحقيق: مصطفى عبد القادر عطاء. بيروت: دار الكتب العلمية.

الحميدي أبو بكر عبد الله بن الزبير. (١٩٩٦م). **مسند الحميدي**. ط١. حقق نصوصه وخرج أحاديثه: حسن سليم أسد الدَّارَانيّ. دار السقا، دمشق: سوريا.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط ١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الإسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الأنصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

الرُّوياني محمد بن هارون. (١٤١٧هـ). **المسند**. ط١. تحقيق: أيمن علي أبو يماني. القاهرة: مؤسسة قرطبة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة. دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحي شفيق حسن. بيروت. دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت. عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

الصنعاني عبد الرزاق بن همام. (١٤١٠هـ). **تفسير القرآن**. ط١. تحقيق: د. مصطفى مسلم محمد. مكتبة الرشد. الرياض.

الطبراني سليمان بن أحمد. (د.ت). **المعجم الكبير**. ط٢. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. القاهرة: مكتبة ابن تيمية.

الطبراني ابو القاسم سليمان بن احمد. (١٤٠٣ء). **الأوائل للطبراني**. ط ١. تحقيق: محمد شكور بن محمود. بيروت: مؤسسة الرسالة، دار الفرقان.

الطبري محمد بن جرير. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠ م). ط١. **جامع البيان في تأويل القرآن**. ط١. تحقي: احمد محمد شاكر. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الطبري محمد بن جرير. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري**. ط ٢. تحقيق: محمد أبو الفضل إبراهيم. بيروت: دار التراث.

الطيالسي سليمان بن داود. (١٤١٩هـ/١٩٩٩م). **مسند أبي داود الطيالسي**. ط ١. تحقيق: الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي. مصر: دار هجر.

عبد الرزاق بن همام الحميري. (١٤٠٣هـ). **المصنف**. ط ٢. تحقيق: حبيب الرحمٰن الأعظمي. الهند: المجلس العلمي.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم

البستوي. المدينة المنورة. مكتبة الدار.

الفاكهي أبو عبد الله محمد بن إسحٰق المكي. (١٤١٤م). **أخبار مكة في قديم الدهر وحديثه**. ط٢. تحقيق: د. عبد الملك عبد الله دهيش. بيروت: دار خضر.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي احمد بن شعيب. (١٤١١ھ/١٩٩١م). **السنن الكبري**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

''نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے، جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ گھوڑوں کو تربیت دینے کے لیے جب بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا تھا تو اہل عرب اِسے اُن کے صوم سے تعبیر کرتے تھے۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔''

(جاوید احمد غامدی، میزان ۳۵۶)

فقہ النبی

جاوید احمد غامدی
ترجمہ و تحقیق: محسن ممتاز

نماز گناہوں کو مٹا دیتی ہے

— ۱ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ:[۱] «أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا، مَا تَقُولُ: ذَلِكَ يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ»؟ قَالُوا: لاَ يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ شَيْئًا، قَالَ: «فَذَلِكَ مِثْلُ الصَّلَوَاتِ الخَمْسِ، يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الخَطَايَا».

و عنه في رواية:[۲] «الصَّلَاةُ الْخَمْسُ، وَالْجُمْعَةُ إِلَى الْجُمْعَةِ، كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ، مَا لَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ».

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: یہ بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ

نہائے تو کیا اُس کے جسم پر میل نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے گی؟ لوگوں نے عرض کیا: اِس صورت میں تو یقیناً میل کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ اِن کے ذریعے سے بالکل اِسی طرح گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔[1]

اِنھی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر بڑے گناہوں سے بچا جائے تو پانچ نمازیں اور جمعے کے بعد دوسرا جمعہ گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔[2]

۱۔ اِس لیے کہ بندہ جب صحیح شعور کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اُس کی معصیت سے اجتناب کرے گا۔ اِس کے نتیجے میں وہ ایک نماز سے دوسری نماز کی لغزشوں پر لازماً ندامت محسوس کرتا اور اُن سے بچنے کے لیے ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ زندگی کی مصروفیتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ غور کیجیے تو توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے اور توبہ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ بندے کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔

۲۔ یہ ٹھیک وہی مضمون ہے جو سورۂ نساء (۴) آیت ۳۱ میں اِس طرح بیان ہوا ہے کہ اگر بڑے گناہوں سے بچتے رہے، جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے تو تمھاری چھوٹی برائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ختم کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا صلہ اُس نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اِس کے بعد آدمی کے چھوٹے گناہوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف کر دیتا ہے۔ یہ معافی، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو قائم رکھنے ہی سے ہوتی ہے، اور نماز اِسی تعلق کا اولین اظہار ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً صحیح بخاری، رقم ۵۲۸ سے لیا گیا ہے۔ اس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کے متابعات اِن کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۷۶۵۱۔ مسند احمد، رقم ۸۹۲۴، ۹۶۹۲۔ صحیح مسلم، رقم ۶۶۷۔ سنن ترمذی، رقم ۲۸۶۸۔ سنن نسائی، رقم ۴۶۲۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۳۱۹۔ تعظیم قدر الصلاۃ، مروزی، رقم ۹۲، ۹۳۔

مستخرج ابی عوانہ، رقم ۱۳۱۳۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۴۹۶۵، ۴۹۶۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۷۲۶۔ مسند السراج، رقم ۱۲۶۰۔ الترغیب فی فضائل الاعمال وثواب ذالک، ابن شاہین، رقم ۵۱۔ السنن الصغیر، بیہقی، رقم ۴۷۵۔

۲۔ یہ روایت اصلاً صحیح مسلم، رقم ۲۳۳ سے لی گئی ہے۔ اس کے متابعات اِن مراجع میں نقل ہوئے ہیں: مسند احمد، رقم ۸۷۱۵۔ سنن ترمذی، رقم ۲۱۴۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۱۰۸۶۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۳۱۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۷۳۳، ۲۴۱۸۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۱۳۱۱۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۴۸۶۔ مسند السراج، رقم ۵۳۲، ۵۳۳، ۱۴۷۵۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۴۱۳۳، ۴۱۳۵۔

"انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے اِس عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون وچرا اِس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔"

(جاوید احمد غامدی، میزان ۳۵۶)

جاوید احمد غامدی

زوجین

یہ صرف مرد و عورت نہیں ہیں، جنھیں زوجین کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز اِسی طرح پیدا ہوئی ہے، لہٰذا سب جوڑا جوڑا ہیں، الاّ یہ کہ وہ اِنھی میں سے کسی جوڑے کے تکملہ اور تتمہ کے طور پر پیدا کی گئی ہوں۔ انسان اگر دقت نظر کے ساتھ غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ نفس اور مادہ ہو، نباتات و حیوانات ہوں، نوع انسانی ہو یا قرآن کی سورتیں، خدا کی مخلوقات میں ہر جگہ تزویج کا یہی اصول کار فرما ہے۔ یہاں تک کہ مادے کی بنیادی ترکیب میں بھی مثبت اور منفی برقی توانائی کا ربط و نظام ہی نتیجہ خیز ہو رہا ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے دیکھیے تو فرد اجتماع کے ساتھ، محنت سرمایے کے ساتھ، علل اپنے معلولات کے ساتھ، قویٰ آلات کے ساتھ، طبائع ارادوں کے ساتھ اور ارواح بھی اِسی طرح اپنے اجسام کے ساتھ جڑے ہوئے زوجین ہی کی صورت میں نظر آئیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ. (الذاریات ۵۱: ۴۹)	”اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔“

مدعا یہ ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور اِسی حیثیت سے اپنی معنویت کا اظہار کرتی ہے تو خود دنیا کو بھی اپنا جوڑا چاہیے، جس سے وہ ایک بامقصد اور بامعنی چیز بنے۔ قرآن جس آخرت کی منادی کرتا ہے، یہ اُس کے وجوب پر قرآن کا استدلال ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس نے اِسی مقصد سے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن غور کیجیے تو ایک دوسری حقیقت بھی اِس کے نتیجے میں آپ سے آپ واضح ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ انسان کی تمام

تگ و دو کا ہدف اُس کی دنیوی زندگی میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ ہر شے، ہر فکر، ہر حرکت اور ہر خیال کے زوجین دریافت کرے، پھر دیکھے کہ وہ کس لحاظ سے زوج زوج ہوئے ہیں، اُن کے مابین کیا پہلو تضادات کے اور کیا توافق کے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہوتے اور نئے زوجین کے تولد کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مرد و عورت کے باہمی تعلق سے جو معاشرت پیدا ہوتی ہے، اُس میں بھی زوجین کے اِس تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ فرد اور اجتماع کے تعلق سے جو سیاست وجود میں آتی ہے، اُس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ محنت اور سرمایہ جس معیشت کو وجود میں لاتے ہیں، اُس کا فہم بھی اِسی پر منحصر ہے۔

یہ کوئی جدلیات نہیں ہے، جسے بعض فلسفیوں نے دریافت کر لینے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ زوج کے اندر زوج کی طلب ہے، جو اُنھیں زوجین بن جانے کے لیے مجبور کر دیتی، اور اِس طرح تضادات سے توافق اور توافق سے تضادات کی صورت میں نئے زوجین پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

دنیا کی فطرت یہی ہے۔ اِس کو سمجھے بغیر اگر علم و عمل کا کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس کا حاصل محض انتہا پسندی ہو گی۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم اور اب فیمنزم وغیرہ، یہ سب اِسی کی مثالیں ہیں۔ فلسفہ کے مختلف مدارس کا مطالعہ کیجیے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ زندگی کا حسن توازن ہے اور یہ اُسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب ہم چیزوں کو اُن کی منفرد صورت میں دیکھنے کے بجاے اُنھیں زوجین کی صورت میں دیکھیں۔ پھر جو تعلق اُن میں پیدا ہوا ہے، اُس کو سمجھیں کہ اُس کی نوعیت کیا ہے، پھر اُسی کے مطابق اُن سے معاملہ کرنے کی سعی کریں۔

یہی علم حقیقی ہے، جو دنیا اور آخرت، دونوں میں انسان کو صلاح و فلاح سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ خدا کی شریعت اِسی علم کو لے کر نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ تمھارے پروردگار نے جب اِس کائنات کو بنایا تو اُس میں میزان قائم کر دی، اِس لیے کہ لوگ بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اِسی طرح میزان قائم رکھیں۔ اہل ایمان کے لیے قیام بالقسط کا حکم، جسے قرآن میں ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے، اِسی ہدایت کی ایک تعبیر ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ. (الرحمٰن ۵۵: ۷-۹)

”اور اُس نے آسمان کو اونچا کیا اور اُس میں میزان قائم کر دی کہ (اپنے دائرۂ اختیار میں) تم بھی میزان میں خلل نہ ڈالو اور انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور وزن میں کمی نہ کرو۔“

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن

مذہب، انسانی فطرت اور تاریخ

(معاصر سوالات کے تناظر میں ایک مکالمہ)

(۱)

مطیع سید: انسان کی داخلی استعداد جس سے انسان حق و باطل اور خیر و شر کو پہچانتا ہے، اس کی تشکیل کس اصول پر ہوتی ہے؟

عمار ناصر: اس کو بالکل اس کی تہ میں جا کر سمجھنا یا اس کا تجزیہ کرنا تو بڑا مشکل کام ہے۔ البتہ قرآن مجید اور احادیث سے جو مختلف اشارات ملتے ہیں، ان سے صوفیہ کچھ چیزیں اخذ کرتے ہیں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اس پر بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حق کو جاننے کی استعداد سب میں یکساں نہیں ہوتی۔ سب انسان فطری طور پر یکساں استعداد لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ شاہ صاحب اس کے پانچ چھ مراتب بیان کرتے ہیں۔ جیسے نفسیات میں لوگوں کی Personality Types بیان کی جاتی ہیں تو وہ اس پہلو سے انسانوں کی مختلف Types بتاتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو حیوانیت کے درجے سے ہی اوپر نہیں اٹھتے، یعنی ان کا زندگی کو دیکھنے کا انداز جبلی ضرورتوں تک محدود ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی اعلیٰ تر مقصد بھی ہوتا ہے، یہ ان کی استعداد سے اوپر کی چیز ہوتی ہے۔ کچھ وہ ہوتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ استعداد تو ہوتی ہے، لیکن غفلت بہت برے طریقے سے طاری ہوتی ہے۔ ان کے لیے متنبہ ہونا، اس طرف متوجہ ہونا کہ کچھ چیزیں ہمیں کسی اعلیٰ حقیقت کی یاددہانی کرا رہی ہیں، یہ مشکل ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو ہوتے تو ذہین ہیں، لیکن ان پر بھی کچھ عوارض، جیسے دنیا کی محبت، دنیا کی سیادت کی

محبت، کچھ تعصبات، یہ اتنے غالب ہوتے ہیں کہ وہ ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ کچھ وہ ہوتے ہیں کہ جن کو تھوڑی تگ ودو کرنی پڑتی ہے، تھوڑا سا کوئی اشارہ مل جائے تو وہ غور کرتے ہیں، اور پھر آخر سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ وہ ہوتے ہیں کہ روغن کو آگ دکھائے جانے کی طرح ہدایت کے منتظر ہوتے ہیں، جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔

تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قبول ہدایت کی استعداد کے اعتبار سے اور عوارض کس طرح کے لاحق ہیں، اس لحاظ سے مختلف Types ہوتی ہیں، لیکن بالکل سائنسی انداز میں یا کلینکل طریقے سے تجزیہ کر کے بتانا کہ اس آدمی کے باطن میں یہ عمل ہو رہا ہے، یہ مشکل کام ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ ہم معرفت کی نگاہ سے دیکھ لیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مطیع سید: یہ جو آپ انسانوں کی مختلف سطحیں بیان فرما رہے ہیں، تو کیا ایک سطح سے دوسری سطح تک بھی آدمی اٹھ سکتا ہے؟

عمار ناصر: اگر تو انسان پیدا ہی ایسے ہوتے ہیں تو پھر شاید نہیں اٹھ سکتا۔

مطیع سید: اس کو اس سطح پر لانے میں ماحول وغیرہ کا کیا کردار ہے؟

عمار ناصر: وہ تو ایک اضافی پہلو ہے۔ سب پر ان کی استعداد کے لحاظ سے ماحول بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

مطیع سید: قرآن نے جو اشارہ کیا ہے: 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' تو کیا یہ اس کی ابتدائی اسٹیج بتا دی گئی ہے کہ اس درجے پر تو ہر انسان کو رکھ دیا گیا ہے کہ وہ فجور اور تقویٰ کی چیزوں میں فرق کر سکے؟

عمار ناصر: غلط اور صحیح کے شعور کے متعلق تو میرے خیال میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک بنیادی سطح پر ہر شخص میں ہوتا ہے، یعنی اخلاقی خیر و شر کا احساس انسانوں میں مشترک ہوتا ہے۔ قرآن کے بیانات پر غور کریں تو وہ بھی یہی حقیقت بیان کرتا ہے کہ انسانوں کو ایک شعور یہ ودیعت ہوا ہے اور جو قومیں بھی اس شعور کو محفوظ رکھنے اور اس کی نشوونما کا انتظام کرتی ہیں، ان کا انداز زندگی مختلف ہوتا ہے، لیکن کیا ہر انسان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خیر کے ساتھ وابستہ ہونے اور شر سے گریز کا داعیہ سب میں کیفیت کے اعتبار سے یکساں ہوتا ہے؟

مطیع سید: تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ آدمی اگر شریر مزاج کا ہے، بداخلاق ہے یا سازشی فطرت کا مالک ہے تو وہ ساری زندگی ایسے ہی رہتا ہے۔ وہ کسی مذہبی جماعت کے ساتھ جڑ جائے، ظاہری طور پر ایک ٹھیٹھ مذہبی انسان بھی بن جائے، وہاں بھی ویسا ہی رہتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت کے آگے کمزور پڑ جاتا

ہے۔ کیا مذہب کچھ نہیں کر سکتا؟ آدمی اگر پیدا ہی ایک بری فطرت کے ساتھ ہوا ہو تو وہ آخر کتنا اچھا بن سکتا ہے؟

عمار ناصر: اصل میں مذہب کو اس طرح دیکھنا کہ یہ کوئی خود کار قسم کی قوت ہے جو کچھ خاص نتائج لازماً پیدا کرنے کا دعویٰ رکھتی ہے، یہ کافی محل نظر بات ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، وہ انسان نے کرنا ہے یا انسان کی کوشش نے کرنا ہے اور اس میں فطری استعداد کے تفاوت کا بہت دخل ہے۔

مطیع سید: پھر یہ جو کہا جاتا ہے کہ مذہب کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کی اخلاقی کانٹ چھانٹ اور درستی اور تربیت کے لیے آتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

عمار ناصر: یعنی یہ اس کا ہدف ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہے کہ انسان کو اس کی رہنمائی دی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔

مطیع سید: کیا تعلیم انسان کی فطرت میں تغیر پیدا کر سکتی ہے؟

عمار ناصر: انسان کی فطرت میں خیر وشر کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ پوٹینشل تو وہاں موجود ہے۔ تعلیم سے خیر کا پہلو غالب آجائے تو اس کو بدلنا تو نہیں کہتے۔ فطرت کے اندر جو پوٹینشل موجود ہے، اسی کو رُخ دینے کی بات ہے۔

مطیع سید: اس میں پھر مذہب کا کیا کردار ہے؟

عمار ناصر: مذہب کا کام تو انسان کی رہنمائی کرنا ہے۔ اب وہ رہنمائی جب انسانوں سے متعلق ہو گی تو ان میں کتنی تبدیلی لا پائے گی یا نہیں لا پائے گی، یہ ایک الگ بات ہے۔ اس میں کئی اور عوامل شامل ہوں گے، اس سے پتا چلے گا کہ یہ رہنمائی عملاً تبدیلی لا رہی ہے یا نہیں لا رہی۔ فرد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا اور کسی معاشرے میں بھی ایسے ہی ہو گا۔ جیسے انبیا کی تعلیم و تبلیغ میں اور ان کی سرگرمی اور محنت میں تو کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن دوسرے عوامل ہیں جو معاون بن گئے تو لوگوں میں ان کی تعلیم نے قبولیت حاصل کر لی۔ کچھ جگہوں پر معاون اسباب نہیں ملے تو نبی کو اکیلے ہی دنیا سے جانا پڑا۔

مطیع سید: جو آدمی ایک اچھی فطرت لے کر آیا ہے، کیا وہ بغیر مذہب کے بھی اچھا ہے اور جو بری فطرت لے کر پیدا ہوا ہے، مذہبی ہو کر بھی وہ ویسا ہی رہتا ہے؟

عمار ناصر: نہیں، یہاں دو چیزیں گڈمڈ ہو گئیں۔ ایک بات یہ ہے کہ مذہب آکر انسان کی نیچر کو بدل دیتا ہے، یعنی اگر میں اپنی نیچر میں خدانخواستہ بدنہاد ہوں اور مذہب آئے گا اور میری نیچر کو ہی بدل دے گا، یہ تو مذہب نہیں کہتا۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ میں اگر خیر وشر میں کسی غلطی کا شکار ہوں تو ایک تو وہ میری اصلاح

کرے گا۔ دوسرے یہ کہ مذہب ایک پیغام دے گا، اور اس کو جب ہم معاشرے میں پھیلائیں گے تو جن جن لوگوں میں بھی استعداد ہے اور جو غفلت کی وجہ سے اور تذکیر نہ ہونے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو سدھارنے میں مذہب ایک قوت کے طور پر کام کرے گا۔

مطیع سید: لیکن ایک آدمی ہے جو فطرتاً شریف ہے، ایک آدمی ہے جو بد طینت ہے۔ مذہب کی تعلیم ان دونوں کے لیے ایک جیسی تو موثر نہیں ہو گی۔

عمار ناصر: درست ہے۔ فطرت کے اندر جو رجحانات موجود ہیں، ان میں سے کوئی خاص رجحان افراد پر غالب ہو سکتا ہے اور بعض پر اتنا غالب ہوتا ہے کہ اس کی گرفت سے باہر نکلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ حدیث میں اس کی تعبیر 'جُبل علیه' کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ یعنی فلاں شخص کی طبیعت اور مزاج میں کوئی وصف جیسے گوندھ دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر تمھیں بتایا جائے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے تو وہ مان لو، لیکن ایک آدمی کا جو مزاج بنایا گیا ہے، اگر کہا جائے کہ وہ اس سے ہٹ گیا ہے، یہ نہ مانو۔ یہ ایسی چیز ہے جو نہیں بدلتی۔

مطیع سید: اس کا مطلب پھر یہ ہے کہ آدمی کی استعداد کے لحاظ سے اس کا حساب لیا جائے گا؟ اگر کسی کو خدا نے تیز مزاج کا بنایا تھا تو اس کا حساب کتاب بھی قیامت کے دن اسی کے مطابق ہو گا؟

عمار ناصر: جی، یہ وہ جانتا ہے کہ کس کو کس طرح کا بنایا تھا، اور اس کی آزمایش کیسی ہوئی تھی، اور اس میں اس نے کس طرح کا طرز عمل اپنایا تھا، اور اب اس کا مواخذہ کیسے بنتا ہے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے۔

مطیع سید: کیا بندگی کا جذبہ انسان کی فطرت میں موجود ہے؟

عمار ناصر: ایک ماورائی حقیقت کے ساتھ جڑنے کی لپک تو انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ انسان کو سکھانے سمجھانے کے لیے کسی خاص کد و کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لیے مذہب ہمیشہ سے انسانی شعور کا حصہ رہا ہے۔ اگر کوئی ماورائی حقیقت ہے تو اس کے ساتھ ایک نوع کے تعلق کا احساس، یہ انسان کے لیے فطری چیز ہے۔

مطیع سید: اگر بندگی کے رجحانات انسان کی فطرت میں ہیں تو آج اتنے بڑے پیمانے پر انسان الحاد کی طرف جا رہا ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟

عمار ناصر: فطرت پر آپ کا ماحول اور تربیت تو اثر انداز ہوتے ہیں۔ فطرت کا مطلب ہے کہ ایک بات آپ کے سامنے آئے جس کا بنیادی شعور آپ کے اندر موجود ہے، اور اس شعور کو زائل کرنے والے اثرات ماحول میں نہ ہوں، کوئی موانع نہ ہوں تو آپ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ آپ کی طبیعت کا اس کی طرف میلان ہو جاتا

ہے، لیکن اگر اس کے مخالف کچھ رجحانات بھی ماحول میں ہوں یا جس کو ہم موانع کہتے ہیں، وہ موجود ہوں تو ظاہر ہے، ان کا بھی انسان پر اتنا ہی اثر ہوتا ہے۔

مطیع سید: گویا وہ انسان کے اندر فطرت کی آواز کو دبا دیتے ہیں، زیادہ موثر ہو جاتے ہیں؟

عمار ناصر: جی زیادہ موثر ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماحول سے متاثر ہونا بھی انسان کی استعداد کا حصہ ہے۔

مطیع سید: غامدی صاحب الحاد پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو کوئی ایشو ہی نہیں ہے۔ دنیا کا اصل چیلنج اسلام ہے۔ اسلام کو کوئی چیلنج نہیں ہے، کیونکہ الحاد کسی قسم کے استدلال پر نہیں کھڑا۔ مجھے ان کی بات سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی اپنی علمی سطح پر تو ایسے ہی ہو گا، لیکن عام سطح پر تو الحاد کے پاس بڑے استدلالات ہیں اور متاثر کن بھی ہیں۔

عمار ناصر: جی ایسا ہی ہے اور یہ دیکھنا اہم ہے کہ آپ کس سطح پر بات کر رہے ہیں۔ ایک سطح پر اگر آپ الحاد کا تجزیہ کریں، اس کی بنیادیں کیا ہیں، اس کا استدلال کیا ہے، اس کی تنقید کریں تو یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ کسی مضبوط بنیاد پر کھڑا نہیں ہے۔ لیکن آپ اس سطح پر دیکھیں جس میں انسان کو تاریخ میں رہتے ہوئے، معاشرے میں رہتے ہوئے چیزیں اپیل کرتی ہیں، متاثر کرتی ہیں تو ظاہر ہے، اس کے نفسیاتی اثرات ہیں۔ اس سطح پر تو ظاہر ہے کہ الحاد موثر ہے۔

مطیع سید: سوال یہ ہے کہ شرک کا کیا استدلال ہے؟ وہ بھی تو کسی استدلال پر نہیں کھڑا تھا، لیکن قرآن اس کی تردید سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے استدلال پر جیسا بھی وہ ہے، ضرب لگاتا ہے۔

عمار ناصر: یہ آپ کا معارضہ صحیح ہے۔ شرک کا بھی تو کوئی استدلال نہیں ہے۔ ایک دور میں تو وہی ساری دنیا کا مسلمہ مذہب تھا۔ تو اس وقت یہ سمجھانے کے لیے کہ اصل حقیقت توحید ہے، اس پر بہت زور لگانا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے کوئی بعید تو نہیں کہ جدید دور میں، آنے والے دور میں شاید آہستہ آہستہ الحاد بھی اس طرح سے مستحکم ہو جائے۔ یہ خارج از امکان نہیں ہے۔

مطیع سید: اجتہاد کا دائرہ دین کے اندر تو محمود ہے کہ اگر کوئی درست جگہ پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے دہرا اجر ہے اور اگر نہیں بھی پہنچ سکا تو ایک درجہ میں اس کو اجر مل جاتا ہے۔ کیا مختلف ادیان کے چناؤ میں بھی یہی اصول ہے کہ آدمی اخلاص سے کوئی بھی مذہب چن لے تو نجات کا مستحق ہو گا؟

عمار ناصر: دین کے دائرے میں اجتہاد کی گنجایش اور دین کے انتخاب میں اجتہاد کی گنجایش تو ایک جیسی نہیں

ہے۔ جہاں حق و باطل کا اختلاف ہو، وہاں گنجایش تو ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ لیکن تکلیف مالا یطاق کا اصول دونوں دائروں میں موثر ہے۔ آدمی کی ذمہ داری اتنی ہی ہے جتنی اس پر بات واضح ہے اور جتنا اس کے پاس اختیار ہے۔ اگر کسی آدمی پر اس درجے میں حق واضح نہیں ہو سکا کہ اس کے پاس انکار کا کوئی عذر نہ ہو، اس کا مواخذہ پھر اسی کے لحاظ سے ہو گا۔

مطیع سید: قرآن کو دیکھیں تو وہ تو اس معاملے میں بڑا سخت حکم لگاتا ہے۔ تو کیا ہم کہیں گے کہ جس دور میں پیغمبر بذات خود موجود تھا، یہ ان کے لیے اتنی سختی ہے؟

عمار ناصر: اس میں دو چیزیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآن کہتا ہے کہ جو حق میں واضح کر رہا ہوں، اللہ کی طرف سے وہی حق ہے، اور دین میں لوگوں نے جو بھی اختلافات پیدا کیے، ان کے متعلق میں اللہ کی طرف سے فیصلہ کر رہا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کچھ خاص لوگوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ قرآن حق لے کر آیا ہے، وہ برحق ہے تو پھر وہ سب کے لیے حق ہے۔ اس میں تو کوئی بحث نہیں۔ اس کے ساتھ دوسری بات یہ ہے کہ جو اس حق کے سامنے آنے کے بعد اسے قبول نہیں کر رہے، ان کے ساتھ قرآن بات کر رہا ہے اور ان پر ایک حکم لگا رہا ہے۔ اس میں بدیہی طور پر فرق واقع ہو گا۔ جن کے سامنے قرآن اتر رہا ہے، جن کے سامنے پیغمبر ہے، جن کے سامنے وہ سارا عمل برپا ہو رہا ہے جس کو غامدی صاحب دینونت کہتے ہیں، ان پر تو حکم یہ لگتا ہے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزر رہا ہے، حالات بدل رہے ہیں، زمانی و مکانی فاصلہ واقع ہو رہا ہے، ویسے ویسے اس سارے عمل کی، اس سارے واقعہ کی جو وہاں وقوع پذیر ہوا، اس کی تصویر بھی لوگوں کے سامنے بدل رہی ہے، دھندلا رہی ہے، اور وہ تاریخ کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ بن رہا ہے۔ تو یہاں یہ حکم لگانا کہ جو حکم قرآن کے براہ راست مخاطبین کا تھا، وہی آج کے منکروں کا بھی ہے، یہ ہمارے انسانی علم کی حد تک بڑا مشکل ہے۔

مطیع سید: لیکن جان بوجھ کر حق کا انکار کرنے والے کیا آج نہیں ہو سکتے؟

عمار ناصر: منکرین پر جو حکم لگایا گیا ہے، ان آیات سے ہم ایک اصول اخذ کر سکتے ہیں کہ حق واضح ہونے کے بعد عناد سے یا تعصب سے انکار کرنے والوں کا حکم اللہ کے ہاں یہ ہے۔ اب کس میں کتنا تعصب ہے، کتنا عناد ہے، کتنا ابہام یا کتنے اس کے شکوک و شبہات ہیں جو مانع بن رہے ہیں، اس کی تعیین ہماری ذمہ داری بھی نہیں ہے اور ہمارا اختیار بھی نہیں ہے۔

[باقی]

محمد وسیم اختر مفتی

السابقون الاولون من الانصار

(۳)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ

قبیلہ اور نسب

حضرت اسعد بن زرارہ یثرب کے قبیلہ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا کا نام عدس بن عبید تھا۔ نجار بن ثعلبہ ان کے ساتویں اور بانی قبیلہ خزرج بن حارثہ دسویں جد تھے۔ ان کی والدہ فریعہ (سعاد: ابن سعد) بنت رافع حارث بن خزرج کی اولاد تھیں۔ حضرت سعد بن زرارہ، حضرت اسعد کے بھائی، حضرت زغیبہ بنت زرارہ ان کی بہن اور حضرت سلیط بن قیس بھانجے تھے۔ حضرت اسعد بن زرارہ اپنی کنیت ابوامامہ سے مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی تین سالہ مختصر اسلامی زندگی میں بیعت و نصرت کے بڑے جلیل القدر اعمال سر انجام دیے، اسی لیے انھیں اسعد الخیر کا لقب عطا ہوا۔ انھیں نقیب بنو نجار بھی کہا جاتا ہے۔

توحید سے رغبت اور اسلام کی طرف سبقت

حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت ابوالہیثم بن تیہان بعثت نبوی سے قبل اپنی فطرت سلیمہ کے اقتضا سے

توحید کے قائل تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ شام کے سفر پر گئے۔ واپسی پر انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص پکار رہا ہے: ابوامامہ، مکہ میں ایک نبی آنے والا ہے، اس کی پیروی کرنا۔ اس کی نشانی یہ ہو گی کہ تم ایک سفر پر جاؤ گے جہاں تمھارے ہم سفر وبا کا شکار ہو کر چل بسیں گے، صرف تم اور تمھارا ایک دوست جو طاعون کا شکار ہو چکا ہو گا، بچ جاؤ گے، ایسا ہی ہوا (الطبقات ابن سعد ج ۱، ذكر علامات النبوة في رسول الله)۔

حضرت اسعد بن زرارہ انصار کے السابقون الاولون کے سرخیل تھے، وہ یثرب کے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ اوس و خزرج کی کشمکش عروج پر تھی جب وہ اور حضرت ذکوان بن عبد قیس اس سلسلے میں عتبہ بن ربیعہ سے ملنے مکہ گئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سنا تو آپ سے ملنے چلے آئے۔ آپ نے انھیں ایمان لانے کی دعوت دی اور قرآن مجید سنایا تو دونوں فوراً مشرف بہ اسلام ہو گئے اور عتبہ سے ملے بغیر یثرب واپس چلے گئے۔ یہ یثرب سے تعلق رکھنے والے پہلے اہل ایمان تھے۔ حضرت اسعد نے اپنے دوست حضرت ابوالہیثم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی خبر دی اور اپنے اسلام کے بارے میں بتایا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اس طرح اپنی قوم میں حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت ابوالہیثم بن تیہان کو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انھوں ہی نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا (مستدرک حاکم، رقم ۵۲۴۹)۔

دوسری روایت کے مطابق حضرت رافع بن مالک زرقی اور حضرت معاذ بن عفراء حضرت اسعد کے مسلمان ہونے سے پہلے یثرب سے عمرہ کرنے مکہ آئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور اسلام قبول کیا۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد بنوزریق پہلی مسجد تھی جس میں قرآن سنایا گیا۔

۱۱/ نبوی کی بیعت

۱۱/ نبوی (جولائی ۶۲۰ء) کے موسم حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسب سابق حج کے لیے آنے والے قبائل کو دعوت دین دینے کے لیے منیٰ تشریف لائے۔ آپ کی ملاقات یثرب کے قبیلہ بنوخزرج کے کچھ افراد سے ہوئی جو اپنے سر منڈا رہے تھے۔ آپ نے انھیں بٹھا کر قرآن مجید سنایا اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اوس و خزرج قبائل بت پرست تھے، مگر انھوں نے اپنے ہم سایہ یہودیوں سے سن رکھا تھا کہ نبی آخر الزمان کا ظہور ہونے والا ہے۔ کلام الٰہی سن کر وہ بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ یہودی جن خاتم النبیین سے ہمیں ڈرایا

کرتے ہیں، یقیناً یہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے پہلے اسلام قبول کر لیں۔ وہ سب ایمان لے آئے اور امید ظاہر کی کہ اگر یثرب کی ساری قومیں —— اوس اور خزرج —— آپ کی دعوت قبول کر لیں تو ان کی باہمی دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔ لہٰذا آپ سے زیادہ معزز کوئی نہ ہو گا۔ ان چھ خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں: حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن عفراء، حضرت رافع بن مالک، حضرت قطبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت جابر بن عبد اللہ بن رئاب۔ یثرب جا کر انھوں نے اپنے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

ابن اثیر نے سات بیعت کنندگان کا شمار کیا ہے، جب کہ زہری اور عروہ بن زبیر نے ان السابقون الاولون من الانصار کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔ ابن سعد نے چھ اصحاب والی روایت کو زیادہ قوی اور اجماع کا حامل قرار دیا ہے۔

بیعت عقبۂ اولیٰ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی دس سالہ زندگی شہر مکہ میں علانیہ تبلیغ کرنے کے ساتھ ہر سال حج کے موقع پر عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں یہ دعوت دیتے ہوئے گزارے: کون ہے جو مجھے پناہ دے کر میری نصرت کرے گا تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں، بدلے میں اس کو جنت ملے گی۔ آپ کو ایک فرد بھی ایسا نہ ملا جو آپ کی دعوت قبول کر کے آپ کی نصرت کرتا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری فرماتے ہیں: ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا اور آپ کی تصدیق کی۔

۱۲/ نبوی (جولائی ۶۲۱ء) کے حج میں عقبہ کے مقام پر خزرج کے جن دس اور اوس کے دو اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی، ان کے نام یہ ہیں: حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن عفراء، حضرت معاذ (معوذ: بلاذری، ابن جوزی، ذہبی) بن عفراء، حضرت رافع بن مالک، حضرت ذکوان بن عبد القیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت عباس بن عبادہ، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت قطبہ بن عامر، حضرت ابو الہیثم بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ۔ ۱۱/ نبوی کی بیعت میں حصہ لینے والے چھ انصار میں سے پانچ اس بیعت میں بھی شامل تھے۔ چونکہ ۱۲/ نبوی کے حج میں عقبہ کے مقام پر ہونے والی یہ پہلی بیعت تھی، اس لیے 'بیعت عقبۂ اولیٰ' کہلاتی ہے۔

بیعت کے الفاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ، اس بات پر میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ

ٹھیراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھوں پاؤں کے درمیان (اعضاے صنفی) سے متعلق کوئی بہتان نہ تراشو گے اور معروف میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔ تم میں سے جو عہد پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو گا اور جس نے ان میں سے کوئی عہد شکنی کی اور اللہ نے اس کا پردہ رکھا تو اس کا فیصلہ اللہ کرے گا، چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے (بخاری، رقم ۳۸۹۳۔ مسلم، رقم ۴۴۸۱۔ احمد، رقم ۲۲۷۵۴۔ مسند شاشی، رقم ۱۱۵۰)۔

عقبہ کی بیعت اولیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش تھی کہ اسلام میں داخل ہونے والے ہر نئے مومن کا ایمان کامل ہو جائے، اخلاق حسنہ سے مزین ہو اور کبائر سے دور ہو جائے۔ اسے 'بیعت النساء' کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ جنگ فرض ہونے سے پہلے لی گئی اور اس کے الفاظ اس بیعت سے ملتے ہیں جو بعد میں صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے حکم پر عورتوں سے لی گئی (الممتحنہ ۶۰: ۱۲)۔

مدینہ واپسی اور تبلیغ دین

اصحاب بیعت عقبۂ اولیٰ نے مدینہ لوٹ کر اسلام کی خوب نشرو اشاعت کی۔ پھر حضرت معاذ بن عفراء اور حضرت رافع بن مالک یہ درخواست لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے کہ قرآن پڑھانے کے لیے کسی کو ہمارے ساتھ بھیجیں۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کا انتخاب کیا اور انھیں حکم دیا کہ اسلام کی طرف لپکنے والے اہل یثرب کو قرآن سکھائیں، شرائع اسلام کی تعلیم دینے کے ساتھ ان میں دین کی سوجھ بوجھ (تفقہ) پیدا کر دیں۔ حضرت مصعب حضرت اسعد بن زرارہ کے مہمان ہوئے۔ وہ انصار کے گھروں اور قبائل میں جاتے، ان کی کوششوں سے خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں رسول پاک کا ذکر نہ پہنچا ہو، انھیں قاری (قرآن پڑھنے والا) اور مقری (قرآن پڑھانے والا) کہا جانے لگا۔ ان کی دعوت کے نتیجے میں اوس کے سرداروں —— اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ —— نے اسلام قبول کیا۔ حضرت مصعب، حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر میں مقیم رہے، لیکن جب بنو نجار کی مخالفت بڑھ گئی تو وہ حضرت سعد بن معاذ کے ہاں منتقل ہو کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھر باقی نہ بچا جس میں چند مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہو چکی ہوں (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۷۲۳۸)۔ واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب کو تعلیم القرآن اور حضرت اسعد کو امامت کی ذمہ داری تفویض فرمائی۔

نماز جمعہ کی ابتدا

تاریخ اسلامی میں پہلا جمعہ کب پڑھا گیا؟ اس باب میں مختلف روایات ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کو قرآن سکھانے کے لیے حضرت مصعب بن عمیر کو بھیجا تو انھوں نے آپ سے جمعہ پڑھانے کی اجازت لی، حالاں کہ تب کوئی امیر نہ تھا (مصنف عبد الرزاق، رقم ۵۱۴۶)

زہری کی روایت ہے کہ مدینہ پہنچ کر حضرت مصعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھ کر جمعہ پڑھانے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت دیتے ہوئے حکم نامہ ارسال فرمایا: اس دن کو دیکھ لینا جب یہود اپنا سبت منانے کے لیے بلند آواز میں پکارتے ہیں۔ آفتاب ڈھلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھا کر اللہ کا قرب حاصل کرو اور حاضرین کو خطبہ بھی دو۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر نے حضرت سعد بن خیثمہ کے گھر میں بارہ اصحاب کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور ان کے لیے ایک بکری بھی ذبح کی (الطبقات الکبریٰ، رقم ۳۵)۔

ابن سیرین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے قبل انصار نے باہم مشورہ کیا کہ یہودیوں کا ایک خاص دن ہے جس میں وہ ہر سات روز کے بعد اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نصاریٰ کا بھی ایک سات روزہ مقررہ دن ہے۔ چلو ہم بھی ایک یوم متعین کر لیتے ہیں جس میں جمع ہو کر اللہ کا ذکر کریں، نماز پڑھیں اور اس کا شکر ادا کریں۔ انھوں نے طے کیا کہ ہفتے (سبت) کے دن یہودی زبور پڑھتے ہیں، اتوار نصاریٰ کا ہوا تو ہم یوم العروبہ مقرر کر لیتے ہیں۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے اسے یوم الجمعہ کا نام دیا۔ اس روز سب ان کے پاس جمع ہوئے اور انھوں نے جمعہ کی نماز پڑھائی۔ بعد ازاں سب نے مل کر بکری کا گوشت تناول کیا۔ اللہ کا حکم 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ'، ''اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو'' (الجمعہ ۶۲: ۹) بعد میں نازل ہوا (مصنف عبد الرزاق، رقم ۵۱۴۴)۔

ابن حجر کہتے ہیں: ابن سیرین کی اس مرسل روایت سے لگتا ہے کہ صحابہ نے جمعہ کا دن اجتہاد سے چنا۔ یہ ماننے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ جمعہ کا اجتماع شریعت اسلامی کا اہم جزو ہے، شارع کے حکم (بیان) کے بغیر اس کا انعقاد نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب ابن حجر نے یہ دیا کہ یہ ماننے میں کوئی مانع نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے جمعہ کی فرضیت کا حکم مکہ میں مل گیا ہو، تاہم آپ کے لیے وہاں جمعہ ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس طرح بیان و توفیق سے جمعہ کی رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے (فتح الباری: شرح حدیث ۸۷۶)، یعنی انصار کا جمعہ قائم کرنا نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل میں ہوا جو آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کو ارسال فرمایا تھا۔

تعبدی امور میں اجتہاد نہیں کیا جا سکتا۔ عہد رسالت میں ایسا واقعہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ حضرت براء بن معرور بیعت عقبۂ ثانیہ کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تو راستے میں اپنے ساتھیوں سے کہا: میں کعبہ کی طرف پشت نہیں کرنا چاہتا، میں اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھوں گا۔ ساتھیوں نے کہا: ہمیں تو یہی اطلاع ہے کہ ہمارے نبی شام کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے ہیں۔ ہم آپ کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے، لیکن حضرت براء نہ مانے۔ مکہ پہنچ کر آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: 'قد کنت علی قبلة لو صبرت علیها' (تم ایک قبلے پر عمل پیرا تھے۔ اس پر صبر کر لیا ہوتا)۔

ہجرت مدینہ کے بعد آپ تحویل قبلہ کے منتظر رہے۔ بنی اسرائیل کی امامت کا دور اور بیت المقدس کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، لیکن آپ نے قبلہ کا رخ نہ بدلا، تاآنکہ اللہ کی طرف سے حکم (بیان) نہ آگیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ تحویل قبلہ کے حکم پر مشتمل آیات (البقرہ ۲: ۱۴۴-۱۴۵) شعبان ۲ھ میں دوران نماز میں اس وقت نازل ہوئیں جب آپ حضرت براء بن معرور کے بیٹے حضرت بشر کے گھر دعوت تناول فرما کر ظہر کی نماز پڑھانے مسجد بنو سلمہ (اب مسجد قبلتین) پہنچے۔

ابتداے جمعہ کی ترتیب

ان روایات کی روشنی میں ابتداے جمعہ کی ترتیب یہ بنتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں ہفتے کے دنوں کے نام سنیچر سے جمعہ تک علی الترتیب یہ تھے: شبار، اول، اہون، جبار، دبار، مونس اور العروبہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پونے چھ سو سال پہلے آپ کے آٹھویں جد کعب بن لؤی نے یوم العروبہ کو اجتماعی عبادت کے لیے مقرر کیا۔ وہ اس دن لوگوں کو جمع کر کے وعظ و نصیحت پر مشتمل خطبہ دیتے، ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسے 'یوم الجمعہ' کا نام دیا۔ پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حضرت مصعب بن عمیر اسلام کے پہلے معلم کی حیثیت سے مدینہ پہنچے تو انھوں نے آپ کے ارشاد اور آپ کی اجازت سے عقبۂ اولیٰ کے بارہ بیعت کنندگان کو حضرت سعد بن خیثمہ کے گھر میں جمعہ پڑھایا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۵۹۱۲)۔ اس وقت مکہ میں کفار کے غلبہ کی وجہ سے جمعہ قائم کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے آپ نے مدینہ میں اس کے قیام کا حکم دیا۔

پھر چالیس انصار نے حضرت اسعد بن زرارہ کی امامت میں بنو بیاضہ کی پتھریلی زمین ہزم النبیت میں

خضمات نامی میدان میں نماز جمعہ ادا کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲/ ربیع الاول ۱۳ نبوی (۲۴/ ستمبر ۶۲۲ء) پیر کے دن مدینہ تشریف لائے۔ آپ نے چار دن (تمام مورخین) یا بارہ سے چودہ روز (بخاری، رقم ۳۹۰۶) بنو عمرو بن عوف کے ہاں قبا میں قیام فرمایا۔ جمعہ کی صبح آپ وہاں سے نکلے، بنو سالم بن عوف کے ہاں پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا۔ یہاں آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور ایک سو اصحاب کو جمعہ کی نماز پڑھائی۔ یہ آپ کا پہلا جمعہ اور مدینہ میں پہلا خطبہ تھا۔ بخاری کی روایت پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر قبا میں بارہ چودہ روز قیام کیا ہوتا تو پہلا جمعہ بھی وہیں پڑھاتے جہاں آپ نے خود مسجد قبا تعمیر کرائی تھی۔

عہد اسلامی کا پہلا جمعہ

صحیح متصل روایات کے مطابق حضرت اسعد بن زرارہ کو یہ سبقت حاصل ہے کہ انھوں نے نماز جمعہ کا آغاز کیا۔ بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد انھوں نے مدینہ میں اسلامی تاریخ کا پہلا جمعہ پڑھایا۔ انھوں نے ہی اس کا انتظام و انصرام کیا۔ مدینہ میں ان کے زیر کفالت بنو مالک بن نجار کے دو یتیموں —— حضرت سہل اور حضرت سہیل —— کی ملکیت ایک کھجوریں سکھانے والا کھلیان یا دالان تھا۔ انھوں نے اس میں جمعہ کا اجتماع منعقد کیا جس میں چالیس کے قریب صحابہ شامل ہوئے۔ دوسری روایات میں بنو بیاضہ کی سنگلاخ زمین ہزم النبیت میں خضمات نامی میدان یا باغ کا ذکر ہے۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے مسلمانوں کے پہلے اجتماع کی خوشی میں ایک بکری بھی ذبح کرائی اور جمعہ میں شریک اہل ایمان کی دعوت کا انتظام کیا۔ پھر حضرت مصعب بن عمیر نے امامت کی ذمہ داری سنبھال لی اور اگلے سال جب وہ انصار کا ایک وفد لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ گئے، تب بھی حضرت اسعد بن زرارہ کو جمعہ پڑھانے کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔

اصحاب عقبہ میں شامل حضرت کعب بن مالک کی بینائی آخری عمر میں جاتی رہی تھی۔ ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن انھیں نماز جمعہ کے لیے لے کر جاتے۔ حضرت کعب جمعہ کی اذان سنتے ہی حضرت اسعد بن زرارہ کے لیے دعاے مغفرت کیا کرتے۔ بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا کہ جمعہ کی اذان کے وقت آپ اسعد بن زرارہ کے لیے خاص طور پر بخشش و رحمت کی دُعا کیوں کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا: اسعد ہی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے قبل نماز جمعہ کا آغاز کیا تھا (ابو داؤد، رقم ۱۰۶۹۔ ابن ماجہ، رقم ۱۰۸۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۰۳۹۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۵۶۰۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۵۲۵۔ صحیح ابن حبان،

رقم ۷۰۱۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۸۹۶۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۷۲۴)۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

۱۳؍ نبوی (جون ۶۲۲ء) حج کے موقع پر جمرۂ اولیٰ کی گھاٹی میں انصار نے اپنے بت پرست ساتھیوں سے چھپ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر جو بیعت کی، اسے 'بیعت عقبۂ ثانیہ' کہا جاتا ہے۔اس اجتماع میں پچھتر افراد مکہ آئے، اس سفر میں حضرت مصعب بن عمیر حضرت اسعد بن زرارہ کے ہم راہ تھے۔ راستے میں انصار نے باہم مشورہ کیا کہ ہم کب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے پہاڑوں میں چکر کاٹتے، خوف زدہ رہنے دیں گے۔ ایام تشریق کی درمیانی رات، یعنی ۱۲؍ ذی الحجہ کو وہ منیٰ کے جمرۂ عقبہ (جمرۂ اولیٰ) کی گھاٹی میں آپ کے پاس خفیہ طور پر جمع ہوئے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب بھی موجود تھے، اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود آپ کے ساتھ ہم دردی رکھتے تھے۔ان اصحاب نے آپ کو یثرب منتقل ہونے کی پیش کش کی تو جناب عباس نے کہا: اے اہل یثرب، تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے رہے ہو۔ سن لو کہ وہ اپنے خاندان میں انتہائی معزز اور محترم ہیں۔ جب کبھی دشمنوں نے ان کے خلاف کوئی حرکت کی تو ہم سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔اب وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ سن لو، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے معذرت کر لو (احمد، رقم ۱۴۴۵۶، ۱۸۷۹۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۲)۔

حضرت اسعد کا رد عمل

جناب عباس کا یہ کہنا حضرت اسعد بن زرارہ پر شاق گزرا۔انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا جواب دینے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا: بولو، تم پر کوئی ملامت نہیں۔ حضرت اسعد گویا ہوئے کہ یا رسول اللہ، ہم نے اپنا دین چھوڑ کر آپ کی پیروی کر لی ہے، آپ کی دعوت پر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے قطع تعلق کر لیا ہے، اپنی سرداری چھوڑ کر آپ کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ ہم نے آپ کے لائے ہوئے دین پر زبان سے ایمان لانے اور دل کی تصدیق کے بعد یہ قبولیت کی ہے۔ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہو گا، ہماری جانیں آپ کی جان پر نچھاور ہوں گی، ہم آپ کی ویسے ہی حفاظت کریں گے، جیسے اپنی عورتوں اور بچوں کی کرتے ہیں۔ ہم نے اگر عہد شکنی کی تو یہ اللہ سے بے وفائی ہو گی۔ جناب عباس کی طرف متوجہ ہو کر حضرت اسعد بن زرارہ بولے: آپ ہماری طرف سے مطمئن نہیں اور ہم سے عہد لینا چاہتے ہیں۔ ہم یہ عہد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی سے نہ کریں گے۔ اللہ کے رسول، حکم فرمائیں، جو عہد اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت براء بن معرور نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا: ہم سچی وفاداری نبھانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنی جانیں قربان کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت براء بن عازب نے کہا: ہم اس بات پر بیعت کرتے ہیں کہ جس سے آپ جنگ کریں گے، ہم اس سے جنگ کریں گے اور جس سے آپ صلح کریں گے، ہم اس سے صلح کریں گے۔

حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک تھام کر کہا: رکو، اے اہل یثرب، ہم اونٹوں کے کلیجے گھلا کر اس لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، آج آپ کو یہاں سے نکال کر لے جانے سے تمام عربوں کو چھوڑنا پڑے گا، تلواریں تمھیں کاٹ ڈالیں گی، تم صبر کر پاؤ گے تو لے جاؤ، تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو گا اور اگر تم اپنے اندر کم زوری پاتے ہو تو رہنے دو، اللہ کے ہاں تم معذور مانے جاؤ گے۔ ان کے ساتھی بولے: اسعد، بیٹھ جاؤ، واللہ، ہم اس بیعت سے کبھی پیچھے ہٹیں گے نہ روگردانی کریں گے (احمد، رقم ۱۴۴۵۶۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۴۵۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۲۷۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۲۵۱)۔

بیعت الحرب

۱۲/ نبوی کا سال گزرنے کے بعد حالات میں تبدیلی آئی اور اسلامی ریاست کے آثار نظر آنے لگے تو نصرت دین اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ضروری ہو گیا۔ چنانچہ بیعت عقبۂ ثانیہ میں جہاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی شقیں شامل کی گئیں۔ اسی لیے اسے 'بیعت الحرب' کہتے ہیں۔ اس بیعت میں انصار کا کوئی دنیوی فائدہ نہ تھا، یہ خالصتاً اللہ پر ایمان کامل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تھی۔ انھیں علم تھا کہ اس سے ان کے جان و مال کو شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے۔

آپ نے قرآن مجید کی آیات تلاوت فرمائیں، اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اسلام کی طرف رغبت دلائی۔ حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے سوال کیا: یارسول اللہ، ہم کس امر پر آپ کی بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا: مستعدی اور کسل مندی میں سمع و طاعت کی، تنگی اور کشادگی میں انفاق کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی، اس بات کی کہ تم اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو گے، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرو گے، میری نصرت کرو گے، جب میں تمھارے پاس آؤں گا تو میرا دفاع کرو گے، ان معاملات

میں جن میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع کرتے ہو، بدلے میں تمھیں جنت ملے گی (احمد، رقم ۱۴۶۵۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۳۵۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۲۵۸)۔

صحابہ ایک ایک دو دو کرکے آپ کے پاس آئے۔ بنو عبد الاشہل کہتے ہیں: عقبۂ ثانیہ میں حضرت ابو الہیثم بن تیہان نے سب سے پہلے بیعت کی۔ بنو نجار کا دعویٰ ہے: حضرت اسعد بن زرارہ نے پہلے بیعت کی۔ بنو سلمہ حضرت کعب بن مالک کو اور حضرت کعب بن مالک حضرت براء بن معرور کو پہلے بیعت کرنے والا بتاتے ہیں۔ حضرت براء بن معرور نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھام کر بیعت کی اور کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے۔ ہم یقیناً آپ کا اسی طرح دفاع کریں گے، جس طرح ہر شے میں اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہم، اللہ کی قسم، جنگ کے بیٹے ہیں اور ہتھیار ہمارا کھلونا ہے (صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۱)۔

نقیبوں کا انتخاب

بیعت مکمل ہو چکی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بارہ سربراہ منتخب کر لیے جائیں، جو اپنی اپنی قوم کے نقیب ہوں اور اس بیعت کی دفعات کی تنفیذ کے لیے اپنی قوم کی طرف سے وہی ذمہ دار اور مکلف ہوں۔ نو خزرج اور تین اوس سے نقیب منتخب کر لیے گئے۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت براء بن معرور، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت منذر بن عمرو، حضرت رافع بن مالک، حضرت سعد بن ربیع، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت اسید بن حضیر، حضرت سعد بن خیثمہ اور حضرت رفاعہ بن عبد المنذر (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۲۵۶)۔ بلاذری، ابن عبد البر، ابن اثیر اور ابن ابی شیبہ نے حضرت رفاعہ کے بجاے حضرت ابو الہیثم بن تیہان کو نقیب شمار کیا ہے۔

نقبا کا انتخاب ہو چکا تو سردار اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اور عہد لیا۔ آپ نے فرمایا:

> ”آپ لوگ اپنی قوم کے جملہ معاملات کے کفیل ہیں۔ جیسے حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے کفیل ہوئے تھے اور میں اپنی قوم، یعنی مسلمانوں کا کفیل ہوں۔ ان سب نے کہا: جی ہاں۔“

نقیب النقبا

حضرت اسعد بن زرارہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قبیلے بنو نجار کا نقیب مقرر فرمایا تھا، وہ نقیبوں میں سب سے کم عمر تھے۔ تاہم روایات میں حضرت جابر بن عبد اللہ کو ان سے بھی کم سن بتایا جاتا ہے۔ آپ نے انصار

کو رخصت کرتے وقت حضرت اسعد بن زرارہ کو تمام نقیبوں کا نگران، نقیب النقبا مقرر فرمایا۔
بیعت ہونے کے بعد صحابہ بکھر گئے تو حضرت سلیط بن عمرو اور حضرت ابوداؤد مازنی (حضرت مالک بن دخشم: بلاذری) پہنچے، انھوں نے حضرت اسعد بن زرارہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بت شکنی

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عمارہ بن حزم اور حضرت عوف بن عفراء نے اپنے قبیلے بنو مالک بن نجار کے بت پاش پاش کر دیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں قیام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر انصار مدینہ نے بیعت عقبہ میں کیے گئے عہد خوب نبھائے۔ آپ نے قبا میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں دو ہفتے قیام کیا، جمعہ کے دن وہاں سے نکلے، مسجد بنو سالم میں جمعہ پڑھایا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بنو سالم، بنو بیاضہ، بنو ساعدہ، بنو حارث، بنو عدی بن نجار کے انصار نے باری باری آپ کو اپنے ہاں ٹھیرنے کی پیش کش کی، لیکن آپ نے فرمایا: میری اونٹنی کو چھوڑ دو، اسے جہاں حکم ہو گا، رک جائے گی۔ قصواء بنو مالک بن نجار میں حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے پاس جہاں اب مسجد نبوی ہے جا کر بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا: یہی میری منزل ہے، چنانچہ آپ نے ان کے گھر چھ ماہ قیام فرمایا۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے یہ سوچ کر کہ میں کسی اور ذریعے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کر لوں، اونٹنی کی باگ پکڑ لی اور اسے اپنے گھر لے کر گئے۔ چنانچہ اونٹنی کی خدمت کی توفیق انھیں مل گئی۔ حضرت اسعد بن زرارہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق صادق تھے۔ اپنے قبیلے کے سردار ہونے کے ساتھ مخیر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خوب صورت پلنگ تحفے میں دیا، جس کے پائے ساگوان کے بنے ہوئے تھے (زاد المعاد، ابن قیم، ج ۱: فصل في ذكر سلاحه واثاثه)۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبا کے قیام کے دوران میں روزانہ حضرت اسعد بن زرارہ کے ہاں تشریف لاتے اور نماز کی امامت فرماتے۔

مہاجرین کی میزبانی

حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد حضرت اسعد بن

زرارہ کے ہاں قیام کیا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت طلحہ حضرت خبیب بن اساف اور حضرت حمزہ حضرت کلثوم بن الہدم کے مہمان ہوئے۔

مسجد نبوی کی تعمیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے اپنے زیر کفالت دو یتیم بھتیجوں (ذہبی) حضرت سہل بن عمرو اور حضرت سہیل بن عمرو کے کھجوریں خشک کرنے والے باڑے یا کھلیان میں مسجد بنائی تھی۔ اس میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پانچوں نمازیں اور جمعہ پڑھایا جاتا تھا۔ ابن ہشام، طبری اور ابن کثیر کہتے ہیں: حضرت سہل اور حضرت سہیل حضرت معاذ بن عفراء کی کفالت میں تھے، جب کہ امام بخاری نے انھیں حضرت اسعد بن زرارہ کے زیر کفالت بتایا ہے (بخاری، رقم ۳۹۰۶)۔ آپ کی آمد کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تو ایک باقاعدہ مسجد کی ضرورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ نے اسی احاطے میں مسجد نبوی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور زمین کی قیمت دریافت فرمائی۔ حضرت سہل اور حضرت سہیل نے کہا: ہم اللہ سے اس کی قیمت چاہتے ہیں، لیکن آپ نے بلا قیمت جگہ لینی منظور نہ فرمائی۔ آپ کے حکم پر حضرت ابو بکر نے زمین کی قیمت دس دینار ادا کی۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت اسعد بن زرارہ نے یتیموں کو زمین کے عوض بنو بیاضہ میں اپنا باغ دے دیا۔ احاطے میں موجود کھجور کے درخت اور غرقد (شجر یہود) کی جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور جاہلی قبروں کو اکھاڑ دیا گیا۔ مسجد کی تعمیر کچی اینٹوں سے ہوئی (مصنف عبدالرزاق ۵۱۴۹)۔

وفات

حضرت اسعد بن زرارہ کا انتقال ہجرت کے نو ماہ بعد شوال یکم ہجری (۶۲۳ء) میں ہوا۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر جاری تھی کہ ان کے گلے میں ایسا زخم ہو گیا جیسے جانوروں میں گل گھوٹو ہوتا ہے (ذبحة: لسان العرب)۔ دوسری روایت کے مطابق ان کا چہرہ سرخ ہو گیا (شوكة: لسان العرب)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا: مجھے ابو امامہ کے بارے میں ملامت نہ کرنا۔ آپ نے ان کے حلق پر گرم لوہے سے داغ لگوایا (کندھے پر: طبرانی) اور فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں اسعد کی طرف سے کوئی رنج نہ رہے۔ دوسری روایت کے مطابق آپ نے ان کے سر پر داغوں کے دو خط کھینچے۔ حضرت ابو امامہ اسعد تھوڑی ہی دیر زندہ رہے، پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: اللہ یہود کو تباہ کرے، یہودی اور عرب کے

منافقین کہتے ہیں: پیغمبر تھے تو اپنے صحابی کو اچھا کیوں نہ کر دیا، علاج کیا تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں اپنی اور کسی دوسرے کی جان پر قدرت نہیں رکھتا (ترمذی، رقم ۲۰۵۰۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۵۵۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۸۵۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۱۹۱۔ احمد، رقم ۱۷۲۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۰۸۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۴۰۷۹۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۹۵۱۵)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن ابی کے مرض الموت میں عیادت کرنے کے لیے تشریف لائے تو فرمایا: میں تمھیں یہودیوں سے محبت رکھنے سے منع کرتا تھا۔ ابن ابی نے کہا: اسعد بن زرارہ یہود کو برا سمجھتے تھے تو ان کو کیا فائدہ ہوا، یعنی وہ بھی فوت ہو گئے (ابوداؤد، رقم ۳۰۹۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۳۹۰۔ احمد، رقم ۲۱۷۵۸)۔

داغنے پر اعتراض

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: میری امت کے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو شگون نہیں لیتے تھے، دغواتے نہیں تھے، منتر نہیں کراتے تھے اور اپنے رب پر توکل کرتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۴۰۸۸۔ شرح معانی الآثار، طحاوی، رقم ۷۱۴۱)۔ بارہا ایسا ہوا کہ آپ سے کسی بیمار کو دغوانے کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے سکوت فرمایا، دو بار سکوت کرنے کے بعد تیسری دفعہ ارشاد فرمایا: چاہے دغوالو، چاہے سینک لو (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۴۰۸۴۔ شرح معانی الآثار، رقم ۷۱۳۹)۔ ایک روایت میں آپ نے دغوانے سے صریحاً منع فرمایا (شرح معانی الآثار، رقم ۷۱۴۳)۔

طحاوی کہتے ہیں: آپ نے دغوانے سے جو منع فرمایا ہے، اس کا اطلاق اس داغنے پر ہوتا ہے جو بیماری آنے سے پہلے اس اعتقاد کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ اس سے وبا ٹل جائے گی، یہ شرک ہے (شرح معانی الآثار، طحاوی، رقم ۷۱۵۳)۔ خود آپ نے حضرت سعد بن معاذ کو بیمار ہونے کے بعد دو بار داغا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۴۰۷۳۔ شرح معانی الآثار، رقم ۷۱۴۹)۔ اس وقت یہ طریقۂ علاج رائج تھا۔ آپ نے حضرت ابی بن کعب کو داغنے کے لیے طبیب بھیجا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۵۴۹۔ شرح معانی الآثار، رقم ۷۱۴۴)۔ حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن عمر کو لقوہ ہوا تو انھوں نے بھی دغوایا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۵۵۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۴۰۷۷)۔

تدفین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسعد بن زرارہ کے غسل کے وقت موجود تھے، آپ نے انھیں تین چادروں کا کفن دیا۔ آپ نے مدینہ میں پہلی نماز جنازہ انھی کی پڑھائی، جنازے کے آگے آگے چلے اور تدفین میں شامل ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق وہ جنت البقیع میں دفن کیے جانے والے پہلے مسلمان تھے (مستدرک حاکم، رقم ۴۸۵۷)۔ طبری کہتے ہیں: حضرت کلثوم بن الہدم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے کچھ دنوں بعد حضرت اسعد سے پہلے وفات پائی۔ مہاجرین میں سے حضرت عثمان بن مظعون انتقال کرنے والے پہلے صحابی تھے۔

قابل فخر جانشین

اسعد بن زرارہ بنو نجار کے نقیب تھے، ان کی وفات پر اس خاندان کے چند ارکان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہمارا نقیب فوت ہو گیا ہے، ان کی جگہ پر کسی کو نقیب تجویز فرمائیں، آپ نے ارشاد فرمایا: تم میرے ماموں (ننھیالی) ہو، اس لیے میں خود تمھارا نقیب ہوں (مستدرک حاکم، رقم ۴۸۵۷)۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ ان میں سے کسی کو ترجیح دیں۔ آپ کے نقیب بننے سے بنو نجار کو وہ شرف حاصل ہو گیا جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے تھے۔

اولاد

حضرت اسعد بن زرارہ کی اہلیہ حضرت عمیرہ بنت سہل بھی بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ مسلمان ہوئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ حضرت اسعد بن زرارہ کی نرینہ اولاد نہ تھی، فریعہ، حبیبہ اور کبشہ، ان کی تین بیٹیاں ہوئیں۔ وفات کے وقت انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی نگہداشت کرنے کی درخواست کی۔ وہ آپ کے کنبے میں شامل ہو گئیں، آپ کی ازواج کے حجروں میں گھومتی پھرتیں۔ آپ نے ہمیشہ ان کا خیال رکھا۔ آپ کے پاس موتی جڑی سونے کی بالیاں، رعاث آئیں تو ان کو پہنا دیں (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۷۵۶۰۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۰۹۶۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۸۶۰)۔ ان تینوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

حضرت فارعہ یا فریعہ حضرت اسعد بن زرارہ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ شادی کی عمر کو پہنچیں تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کے حضرت نبیط بن جابر کا رشتہ قبول کر کے ان سے نکاح فرما دیا۔ان کا بیٹا ہوا تو آپ کے پاس لے کر آئیں اور نام رکھنے کی درخواست کی۔آپ نے عبدالملک نام رکھا اور برکت کی دعا فرمائی۔ دوسری بیٹی حضرت حبیبہ کا بیاہ اوس کی شاخ بنو عمرو بن عوف کے حضرت سہل بن حنیف سے ہوا۔ حضرت کبشہ حضرت اسعد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ان کی شادی بنو عمرو بن عوف کے عبداللہ بن ابو حبیبہ سے ہوئی۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ(ابن ہشام)،الطبقات الکبریٰ(ابن سعد)، جمل من انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم و الملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)،الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ(ابن حجر)۔

[باقی]

”بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اِس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اُس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجاے، اُسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں، اور بعض حالتوں میں اپنے زیردستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔اِس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“(جاوید احمد غامدی، میزان ۳۶۵)

ڈاکٹر عرفان شہزاد

شورائیت اور ملوکیت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نظم اجتماعی انسان کی سماجی ضرورت ہے۔ سماجی تعامل کے حدود و قوانین اور تنازعات کے فیصلے کے لیے متفقہ اتھارٹی کا قیام ناگزیر ہے، جس کے فیصلوں کے آگے خواہی نہ خواہی سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ یہ نہ ہو تو دوسری صورت انارکی ہے، جسے معقولیت گوارا نہیں کر سکتی۔ نظم اجتماعی کے قیام کا تقاضا کچھ انسانوں کا اختیار دوسرے انسانوں پر قائم کرنے کا سبب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ اختیار ان کی مرضی اور انتخاب سے ان پر قائم کیا جائے۔ شورائیت یا جمہوریت کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ. (الشوریٰ ۴۲: ۳۸) ''اور اُن کا نظام اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہے۔''

شورائیت سے ماورا یا بے پروا ہو کر اقتدار کو کسی فرد، خاندان یا جماعت میں محدود کرنا صاحبان اقتدار کا تجاوز ہے۔ اس سے نہ صرف عوام کا حق انتخاب غصب ہوتا ہے، بلکہ دیگر باصلاحیت لوگوں کو اقتدار میں آکر اپنے جوہر دکھانے کے مواقع بھی مسدود ہو جاتے اور اقتدار کے حریفوں کے درمیان تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ بادشاہتوں کے دور میں طالع آزماؤں کے درمیان کشاکش کی ساری تاریخ اسی کا نتیجہ ہے۔ حکمرانوں کے عزل و نصب کے کسی متفقہ دستور کے بغیر صدیوں تک یہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ دستوری حکومتوں کا دور آیا اور انتخابات کی راہ

سے حصول اقتدار کے مسئلے کا سیاسی حل عمل میں آگیا۔

شورائیت کی اس اہمیت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے شرعی حکم کا درجہ نہیں دیا۔ چنانچہ اس کی خلاف ورزی کسی شرعی حد کی پامالی نہیں کہلائے گی۔ حالات کا تقاضا ہو تو شرعی احکام میں بھی رخصت دے دی جاتی ہے، شورائیت کا معاملہ تو شرعی بھی نہیں، حکمت عملی سے متعلق ہے، چنانچہ اگر حالات کے تقاضے سے حکومت کی کوئی دوسری صورت اختیار کر لی جائے تو اس پر کفر و ضلالت کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا، اور نہ جان و مال کی قربانیاں دے کر مثالی صورت قائم کرنے کی کوشش کوئی دینی جواز رکھتی ہے۔ خود بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملوکیت ہی کو اختیار کیا تھا، کیونکہ ان کے حالات کا تقاضا یہی تھا۔ بنی اسرائیل کے درمیان قبائلی رقابت انھیں کسی متفقہ قیادت پر مجتمع نہیں ہونے دے سکتی تھی، انھیں تو طالوت کے انتخاب پر اعتراض تھا، جسے اللہ نے خود ان کے لیے منتخب کیا تھا۔ اللہ کو ان کی اجتماعیت مقصود تھی، جو شورائیت کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ انبیا کی موجودگی میں ان کے ہاں موروثی بادشاہت جاری رہی۔

گویا، انتخاب اگر شورائیت اور ملوکیت میں ہو تو شورائیت کو منتخب کرنا ہی علم و عقل کا فیصلہ ہونا چاہیے، لیکن انتخاب اگر ملوکیت اور انارکی میں ہو تو ملوکیت کا انتخاب ناگزیر ہے۔ جمہوریت کے جدید دور میں بھی ہنگامی حالات کے دوران میں جمہوری اقدار معطل کر کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔

حکومت منتخب ہو یا غیر منتخب، اگر ظلم اور ناانصافی سے کام لے تو اس کی مذمت اور اصلاح فقط زبانی طور پر ہی کی جا سکتی ہے۔ انفرادی جہاد کا یہی میدان ہے۔ یہاں کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے۔ اس میں جان بھی چلی جائے تو افضل شہادت کہلاتی ہے۔ اس سے زیادہ کسی اقدام کا کوئی حکم نہیں دیا گیا، بلکہ دین کی رو سے کسی غیر عادل حکومت کے خلاف بغاوت کرنا یا اسے بزور بازو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا ممنوع ہے، کیونکہ اس سے نظم اجتماعی مختل ہو سکتا ہے، جو انارکی اور فساد فی الارض پر منتج ہو گا۔ البتہ حکومت کے غیر اخلاقی احکام میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ پر امن احتجاج کا حق یہیں تک ہے۔

حکومت کا ظلم فساد فی الارض کی نوعیت اختیار کر لے تو اس صورت میں ہجرت کر جانے کا حکم ہے۔ یہ چارہ بھی میسر نہ ہو تو ہابیل کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اپنی جان دے کر بھی دوسرے کی جان نہ لینے کو زیادہ بہتر عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ کے ارشادات نقل ہوئے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب

«إنها ستكون فتن، ألا ثم تكون فتنة، القاعد فيها خير من الماشي فيها، والماشي فيها خير من الساعي إليها، ألا فإذا نزلت أو وقعت، فمن كان له إبل فليلحق بإبله، ومن كانت له غنم فليلحق بغنمه، ومن كانت له أرض فليلحق بأرضه»، قال: فقال رجل: يارسول الله، أرأيت من لم يكن له إبل ولا غنم ولا أرض؟ قال: «يعمد إلى سيفه فيدق على حده بحجر، ثم لينج إن استطاع النجاء، اللّٰهُمَّ هل بلغت، اللّٰهُمَّ هل بلغت، اللّٰهُمَّ هل بلغت»، قال: فقال رجل: يا رسول الله، أرأيت إن أكرهت حتى ينطلق بي إلى أحد الصفين أو إحدى الفئتين، فضربني رجل بسيفه أو يجيء سهم فيقتلني، قال: «يبوء بإثمه وإثمك ويكون من أصحاب النار».
(مسلم، رقم ۷۲۵۰)

فتنے برپا ہوں گے، سن لو! پھر (اور) فتنے برپا ہوں گے، ان (کے دوران) میں بیٹھا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا، اور ان میں چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔ یاد رکھو! جب وہ نازل ہوں یا واقع ہوں تو جس کے (پاس) اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے پاس چلا جائے، جس کے پاس بکریاں ہوں وہ بکریوں کے پاس چلا جائے اور جس کی زمین ہو، وہ اپنی زمین میں چلا جائے۔ (حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے) کہا: تو ایک شخص نے عرض کی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے پاس یہ اونٹ ہوں، نہ بکریاں، نہ زمین؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ اپنی تلوار لے، اس کی دھار کو پتھر سے کوٹے (کند کر دے) اور پھر اگر بچ سکے تو بچ نکلے!“ پھر آپ نے فرمایا: اے اللہ، کیا میں نے (حق) پہنچا دیا، اے اللہ، کیا میں نے (حق) پہنچا دیا، اے اللہ، کیا میں نے پہنچا دیا۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اگر مجھے مجبور کر دیا جائے اور لے جا کر ایک صف میں یا ایک فریق کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے اور کوئی آدمی مجھے اپنی تلوار کا نشانہ بنا دے یا کوئی تیر آئے اور مجھے مار ڈالے تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اگر تم نے وار نہ کیا ہوا) تو وہ اپنے اور تمھارے گناہ سمیٹ لے جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہو جائے گا۔“

مسلمانوں کی حکومت اگر ظالم نہیں، اپنے دینی فرائض سے غافل نہیں یا کسی بڑے انحراف یا کھلم کھلا کفر پر مصر نہیں تو کسی فرد یا جتھے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے تئیں نظم اجتماعی کی کسی بہتری یا اسے کسی مثالی صورت میں بحال کرنے کے لیے ہتھیار اٹھالے اور نظم اجتماعی کو مختل کرنے کی کوشش کرے، اگرچہ اسے اکثریت کی حمایت بھی حاصل ہو، اس لیے کہ یہ کوئی دینی فریضہ یا خدا کا مطالبہ نہیں ہے، جس کے لیے لوگوں کی جان کو خطرے میں ڈالا جائے، بلکہ یہ فساد فی الارض کے جرم عظیم کا ارتکاب ہے، خواہ یہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے۔

کسی مصلح کو اپنے اصلاحی اقدام کے لیے اگر اکثریت کی حمایت بھی حاصل نہیں تو اسے خدائی فوج دار بننے کا خبط سرے سے پالنا ہی نہیں چاہیے۔ حکومت کی اصلاح یا کسی مثالی صورت میں اس کی بحالی کے لیے تعلیم اور ابلاغ کے پرامن طریقوں سے راے عامہ ہموار کرنے کے سوا کسی کارروائی کی کوئی گنجایش دین میں نہیں ہے۔

ارباب حکومت سے مثالی رویے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اختیارات کے ساتھ تجاوزات کا ہونا غیر متوقع نہیں ہوتا۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ کوئی دوسرا شخص یا سیاسی گروہ اختیارات کے تجاوزات سے مبرا رہے گا یا اس کے جان نشین لازماً ایسے نیک لوگ ہوں گے جو کوئی تجاوز نہیں کریں گے۔ اس خوش گمانی کی جب کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تو حکومت کی تبدیلی کے لیے براہ سازش یا بزور بازو اسے تبدیل کرنے کا کوئی عقلی جواز بھی دستیاب نہیں رہتا۔

مسلمانوں سے مطلوب سیاسی رویے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات درج ذیل ہیں:

عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «من رأى من أميره شيئًا يكرهه فليصبر عليه، فإنه من فارق الجماعة شبرًا فمات إلا مات ميتة جاهلية».

(بخاری، رقم ۷۰۵۴)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے امیر کی کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھی تو اسے چاہیے کہ صبر کرے، اس لیے کہ جس نے جماعت سے ایک بالشت بھر جدائی اختیار کی اور اسی حال میں مرا تو وہ جاہلیت کی سی موت مرے گا۔“

عن جنادة بن أبي أمية، قال: دخلنا على عبادة بن الصامت وهو مريض، فقلنا: حدثنا أصلحك الله، بحديث ينفع الله به، سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: دعانا

”حضرت جنادہ بن ابو امیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، جب کہ وہ حالت مرض میں تھے۔ چنانچہ ہم نے ان سے کہا کہ ہمیں ایسی حدیث بیان کیجیے جس کے ذریعے سے اللہ ہمیں نفع دے اور آپ

رسول الله صلى الله عليه وسلم، فبايعناه، فكان فيما أخذ علينا: أن بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا، وعسرنا ويسرنا، وأثرة علينا، وأن لا ننازع الأمر أهله، قال: «إلا أن تروا كفرًا بواحًا عندكم من الله فيه برهان». (مسلم، رقم ۴۷۷۱)

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو تو انھوں نے کہا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو ہم نے آپ سے بیعت کی اور آپ نے ہم سے جن چیزوں پر بیعت لی وہ یہ تھیں کہ ہم خوشی اور ناخوشی میں اور مشکل اور آسانی میں اور خود پر ترجیح دیے جانے کی صورت میں بھی اطاعت کریں گے، اور یہ کہ ہم اقتدار کے معاملے میں اس کی اہلیت رکھنے والوں سے تنازع نہیں کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البتہ، اگر تم کھلم کھلا کفر دیکھو، جس کے خلاف تمھارے پاس واضح دلیل موجود ہو (تو اس صورت میں معصیت کے کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت نہیں کی جائے گی)۔“

تاہم، اس بنا پر ہتھیار اٹھانے کی اجازت یا حکم نہیں دیا گیا۔

ایک روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے حکومت کی کسی برائی یا فسق کو روکنے کے لیے ہاتھ اور ہتھیار اٹھائے جا سکتے ہیں۔ روایت یہ ہے:

فقال ابو سعيد: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: «من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان». (مسلم، رقم ۱۷۷)

”حضرت ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے جو شخص منکر (ناقابل قبول کام) دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے، اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے اسے برا سمجھے، اور یہ سب سے کم زور ایمان ہے۔“

اس ارشاد میں برائی کو روکنے یا بدلنے کی ہدایت انسان کی استطاعت سے مشروط ہے، یعنی انسان کے دائرۂ اختیار کے اندر منکر یا برائی کو روکنے کی ہدایت اور اس سے اغماض برتنے پر ایمان کی کمی کا الزام دیا گیا ہے۔ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر کسی کام کا انسان کو مکلف نہیں ٹھیرایا گیا۔ ہر شخص یا جتھا اگر اصلاحی ایجنڈا لے کر حکومتیں تبدیل کرنے نکل کھڑا ہو تو یہ خانہ جنگی اور فساد کا سبب بنے گا۔

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد سیاسی تبدیلی کی کوشش میں فتنے پیدا کرنے والوں سے خبردار کرتے ہوئے مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ وہ کسی جتھے کا حصہ بن کر ہتھیار نہ اٹھائیں۔

”روزہ اِس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اُس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ اِن چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اُس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم و اعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال و عمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خود مختاری کے ادعا سے دستبردار ہو جائے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع و بصیر، علیم و حکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے جو اُس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔“ (جاوید احمد غامدی، میزان ۳۶۳)

معاذ بن نور

کھیتی

کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک بچہ ہر چیز فوراً چاہتا ہے، جب کہ ایک بالغ صبر سے کام لیتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ کچھ وقت لگتا ہے؟ زندگی فوری تسکین کا نام نہیں ہے۔ جیسے ایک ذہین اور محنتی کسان آج بیج بوتا ہے اور صبر سے کل کے اچھے پھل کی توقع کرتا ہے، ہمیں بھی آج محنت کرنی ہے تاکہ کل بہتر نتائج حاصل کر سکیں۔ یہی زندگی کا وظیفہ ہے، جو دنیا اور آخرت میں کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ جیسے جیسے ہم بالغ ہوتے ہیں، ہم اس قانون قدرت کو دریافت کر لیتے ہیں کہ آج کی قربانیوں کا صلہ کل ملتا ہے، اور یہی پایدار کامیابی کی راہ ہے۔ قرآن ہمیں یاد دلاتا ہے:

”اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو۔ اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔“
(الحشر ۵۹: ۱۸)

آپ بھی اپنے آپ سے پوچھیں کہ میں نے اپنے خالق، اپنے آپ، اپنے والدین، بیوی، بچوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھے تعلق کے لیے آج کیا قربان کیا ہے؟ کیا آپ ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو بیج کی طرح سمجھتے ہیں؟ آپ ان سے فوراً صلے کی توقع کرتے ہیں یا آپ ان کے ساتھ تعلق کو صبر کے ساتھ ایک کامیاب کسان کی طرح پروان چڑھاتے ہیں؟

دوسری بات یہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایک اچھے کسان کا ارادہ، عمل اور متوقع نتیجہ حقائق کی روشنی میں باہم مربوط ہوتے ہیں، جس کی بنیاد پر وہ اپنی محنت پر ایک حد تک اعتماد رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے رشتوں سے متعلق معاملات میں ہمارے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ارادوں، عمل اور متوقع نتائج کا حقائق کی

بنیاد پر مربوط ہونا اور ان کے بار آور ہونے پر ہمارا ایک حد تک اعتماد ہونا تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے۔

جب ارادے، عمل اور متوقع نتائج محض جبلی خواہشات نہیں، بلکہ سچائی کے مطابق ہوں تو وہ باہم مربوط ہو کر ایک سیدھی راہ تشکیل دیتے ہیں۔ ہم اپنی زندگیوں میں اس ہم آہنگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قلب و ذہن کا ارتکاز حاصل ہوتا ہے، نتائج درست ہوتے ہیں اور اپنی محنت کے درست ہونے پر ہمارا اعتماد مزید بڑھتا ہے۔ اس سیدھی راہ کی موجودگی میں جب شیطان خواہشات اور جذبات کو بھڑکاتا ہے تو ایک مومن فوراً ان انحرافات کو پہچان کر ان کو درست کرتا ہے، جس سے اس کے عمل میں اعتماد بحال ہوتا ہے۔ سچائی سے انسان کے ارادوں، افعال اور متوقع نتائج کا یہ تعلق نہ ہو تو انسان کے لیے اپنی محنت پر یہ بنیادی اعتماد حاصل کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

شیطان انسان کی جبلتوں اور جذبات کو انگیخت کر کے مسلسل کوشش میں رہتا ہے کہ انسان کے ارادے، افعال اور متوقع نتائج باہم متناقض ہوں اور سچائی سے ہٹ جائیں، جب کہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ سچائی اور انصاف کے مطابق ہوں۔ اسی لیے اللہ نے ہمیں سننے، دیکھنے کی صلاحیت اور عقل دی تاکہ ہم صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں اور اپنے ارادوں کو نیک اور سچا بنا کر درست افعال سے اور درست افعال کو حقیقت پسندی پر مبنی متوقع نتائج سے جوڑ سکیں:

> ”اور اس نے تمھیں سننے، دیکھنے اور (سمجھنے کے لیے) عقل دی (مگر تم اپنے ہواے نفس کی پیروی کرنے لگے)؛ تم کم شکر گزار ہو۔“ (السجدہ ۳۲: ۹)

یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر اس وقت رشتوں اور تعلقات کو بہتر کرنے کے لیے اپنی محنت پر اعتماد کھو بیٹھتے ہیں جب ہم اچھی نیت اور محنت کے ساتھ بوائی کا کام کیے بغیر ہی شیطان کی اکساہٹ پر (کہ تو نے اب بہت کر لیا) کٹائی کی توقع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سچائی کی راہ کو چھوڑ کر صرف جذبات اور خواہشات کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

تیسری بات یہ ذہن نشین رہے کہ تعلقات میں اختلافات آتے ہیں، جیسے ایک اچھا کسان فصل کو لاحق خطرات سے عقل کو بھرپور استعمال میں لاتے ہوئے صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے، لیکن ہم ایک ذہین کسان کی طرح رشتوں اور تعلقات میں پیدا ہونے والے مسائل پر غور کرنے کے بجاے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھتے، پھٹ پڑتے اور اناؤں کی جکڑ بندیوں کے غلام بن کر انمول رشتوں اور تعلقات کو کھو بیٹھتے ہیں۔

شیطان کے اس پھندے سے بچنے کے لیے آپ ہمیشہ یہ سوال اپنے آپ سے کرتے رہیں کہ کیا آپ کٹھن

سے کٹھن ترین حالات میں بھی دوسروں کی تنقید کو عاجزی سے سن رہے ہیں؟ یہ مانتے ہوئے کہ بدترین انسان کی بات میں بھی میرے لیے حقیقت اور بہتری کا کوئی پہلو ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس بنیاد پر تنقید کو رد کر دیتے ہیں کہ اس شخص سے مجھے کسی خیر کی توقع نہیں تو یہ تکبر ہے، ہم شیطان کے نزغ میں مبتلا ہو کر غرور اور فریب میں پڑ جاتے ہیں اور تعلقات میں بہتری کا دروازہ اپنے ہی ہاتھوں سے بند کر دیتے ہیں۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں بغض کے بجائے دھیان سے اور تکبر کے بجائے عاجزی سے بات کو سننا چاہیے:

”جو لوگ بات سنتے ہیں اور اس میں سے بہترین بات کو اختیار کرتے ہیں۔“ (الزمر ۳۹:۱۸)

زندگی کے ہر پہلو میں، خاص طور پر ہمارے رشتوں اور تعلقات میں ہمیں چاہیے کہ ہم خدمت، حقیقت پسندی، خود اعتمادی، صبر اور عاجزی کا جذبہ اختیار کریں۔ ہمیشہ خود پر نگاہ رکھیں کہ کیا آپ ان لافانی اصولوں کی بنیاد پر تعلقات میں بہتری کے بیج بوتے ہیں یا انا اور جلد بازی کے ہاتھوں رشتوں اور تعلقات میں بہتری کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں؟

اللہ ہمیں ایسے دل عطا فرمائے جو سنیں، ایسے دماغ دے جو غور کریں اور ایسی روحیں دے جو عاجزی کو اپنائیں۔

”تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اُس کی حقیقت اِس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اُس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل و انصاف، عفو و درگذر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔“

(جاوید احمد غامدی، میزان ۳۶۴)

شاہد رضا

روزہ اور رمضان: متفرق احکام

[جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو سے اخذ و استفادہ پر
مبنی زیر طبع کتاب ''روزہ اور تربیت نفس'' سے انتخاب]

رمضان میں حکومت کی ذمہ داری

سوال: ماہِ رمضان میں عوام کو سہولتوں کی فراہمی کے لیے مسلمان حکمرانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: سہولتوں کے لیے وہی کام کرنے چاہییں جو آدمی اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ لوگوں کے لیے مہنگائی مسئلہ بن رہی ہے اور حکمران ان کی مدد کر سکتے ہیں تو ضرور کرنی چاہیے۔ اگر وہ لوگوں کے لیے کچھ چیزیں سستی کرا سکتے ہیں تو انھیں یہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر ادا کرنی چاہیے۔ جس طرح ہم مغربی ملکوں میں دیکھتے ہیں، اسی طرح عام لوگوں کو بھی یہ روایت قائم کرنی چاہیے کہ وہ اپنے کاروبار میں اس اخلاقیات کا خیال رکھیں گے کہ ایک تہوار آگیا ہے، اس میں لوگ زیادہ خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے سہولت پیدا کی جائے۔ روزہ رکھنے میں اوقات سے متعلق بھی عام طور پر مسلمان حکومتیں ایسی تبدیلیاں کر دیتی ہیں جس میں لوگوں کے لیے سہولت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے یہ سہولت ضرور پیدا کرنی چاہیے۔

عبادات کے بارے میں ایک مسلمان حکمران یا مسلمانوں کی حکومت جو سہولتیں بھی لوگوں کے لیے بہم پہنچا سکتی ہے، اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔ معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ سہولتیں بہم پہنچائے۔ سہولت یہ نہیں ہے کہ مثال کے طور پر ہمارے ہاں لوگوں کے ٹیکس کے روپے سے لوگوں کو حج کرانا شروع کر دیا جاتا ہے؛

سہولت پہنچانا بالکل الگ چیز ہے، مثلاً ایک آدمی حج کرنا چاہتا ہے، اس نے اپنے لیے اسباب فراہم کر لیے ہیں، اب آپ اسے بہتر سے بہتر طریقے سے کیسے وہاں پہنچائیں گے، اس میں کیا رعایتیں دے سکتے ہیں، ان کا لحاظ کرنا چاہیے۔ چنانچہ سہولت فراہم کرنا تو حکمرانوں کا کام ہے۔ دینی و دنیوی، ہر معاملے میں حکومت اسی لیے قائم کی جاتی ہے کہ امن فراہم کرے اور لوگوں کے لیے سہولتیں پیدا کرے۔[1]

روزے میں آنکھ، کان اور ناک میں دوا ڈالنا

سوال: کیا آنکھ، کان اور ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: کھانے پینے کی جگہ ہمارا منہ ہے۔ لہٰذا کسی چیز کو بھی اس کے ذریعے سے ہمارے اندر نہیں جانا چاہیے۔ روزے کی حالت میں دوسری چیز جنسی روابط ہیں۔ بس یہی روزہ ہے۔ اس کے علاوہ آنکھوں، کانوں میں دوا ڈالی ہے، کسی مرض میں انجیکشن لگوایا ہے، اس سے روزے کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ روزے کو اسی وقت کوئی نقصان پہنچتا ہے جب کچھ کھایا پیا یا ازدواجی تعلق قائم کیا ہو۔

یہ کہنا کہ اگر دوائی کا حلق میں ذائقہ محسوس ہو تو یہ درست نہیں ہے، یہ محض منطق ہے۔ یہ عبادت ہے اور عبادت میں جو اللہ تعالیٰ نے پابندی لگا دی ہے، بس اسی تک محدود رہیے۔ اس میں اس طرح کے تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ ایک سادہ بات کہی گئی ہے اور سادہ بات پر رہتے ہوئے روزہ رکھیے۔[2]

روزے میں دفتری کام انجام نہ دینا

سوال: کیا روزے کی وجہ سے دفتری کام ٹھیک سے انجام نہ دینا گناہ ہے؟

۱۔ https://ghamidi.com/videos/what-is-the-responsibility-of-a-muslim-ruler-in-order-to-facilitate-the-people-in-the-month-of-ramadan-6332

۲۔ https://ghamidi.com/videos/instilling-medication-into-eyes-ears-or-nose-and-fasting-3020

جواب: اس کے دو پہلو ہیں:

ایک پہلو کا تعلق فرد سے ہے۔ اگر کوئی شخص ملازمت کرتا ہے تو اسے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ روزے سے ہے تو اسے زیادہ مشقت اٹھا کر لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے۔ جب اس نے معاہدہ کیا ہوا ہے کہ اسے دفتری اوقات میں حاضر ہونا ہے، لوگوں کی خدمت کرنی ہے یا اس کے اوپر ذمہ داریاں ہیں تو اسے ان کو بدرجۂ اتم پورا کرنا چاہیے۔ رمضان تو اسی تربیت اور تلقین کے لیے آیا ہے کہ اسے اپنے عہد وفا کرنے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ تقویٰ اسی چیز کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے کسی فرد کے لیے تو کسی رخصت کا سوال ہی نہیں۔

دوسرے پہلو کا تعلق معاشرے سے ہے۔ اگر مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور ان کے معاشرے میں اگر ریاست کا نظم لوگوں کے لیے سہولت بہم پہنچاتا ہے؛ اوقات کم کر دیے جاتے ہیں یا ان میں کوئی تبدیلی کر دی جاتی ہے یا ذمہ داریوں کو ہلکا کر دیا جاتا ہے تو یہ عین مطلوب ہے اور اسے ضرور کرنا چاہیے تاکہ لوگ عبادت کر سکیں، یعنی عبادت کی سہولت بہم پہنچانا ذمہ دار اداروں کا کام بھی ہے اور مسلمان معاشرے میں قائم ہونے والی حکومت کا کام بھی ہے، لیکن اگر کسی جگہ یہ سہولت نہیں دی جا رہی، آپ ذمہ داری میں اسی طرح شریک ہیں، جس طرح دوسرے شریک ہیں، آپ کسی غیر ملک میں ہیں، ایسی جگہ پر ہیں جہاں حکومت یا ادارے اس طرح کی رعایت نہیں دیتے تو پھر آپ کو بہر حال زائد مشقت اٹھا کر اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔

اللہ کے ہاں یہ چیز عذر نہیں بنے گی کہ آپ اس موقع پر لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر سرخرو ہو جائیں کہ میرا روزہ تھا، اس وجہ سے میں نے کسی کا کام نہیں کیا یا میں نے یہ ذمہ داری نہیں اٹھائی یا میں اٹھ کر گھر چلا گیا یا میں اپنے دفتر ہی میں لیٹا رہا۔ یہ آپ کو حق نہیں ہے کہ ایسا کریں۔[۳]

مشکل حالات میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت

سوال: کیا مشکل حالات میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت شرعی حکم ہے؟

۳-https://ghamidi.com/videos/is-it-deemed-sinful-for-someone-who-is-fasting-to-not-fulfill-his-duties-adequately-1915

جواب: یہ رخصت تو خود اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کہا کہ سفر میں تمھیں روزہ ہی رکھنا چاہیے یا بیماری میں اپنے آپ کو بے شک، موت کے حوالے کر دو، مگر تمھیں روزہ ہی رکھنا چاہیے یا بیماری اور روزے کی مشقت اٹھاؤ۔ یہ اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک موقع پر فرمایا کہ:

لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ. ”سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔“

(ابوداؤد، رقم ۲۴۰۹)

یعنی کوئی آدمی اگر سفر میں روزہ رکھتا ہے تو یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ترغیب دی ہے۔ ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ سفر کی مشقت کی وجہ سے روزہ بھی رکھے ہوئے ہے اور اس طرح کی صورت حال سے بھی دوچار ہے جو اس کے لیے موزوں نہیں تھی تو یہ نصیحت فرمائی کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے (ابوداؤد، رقم ۲۴۰۹)۔ اللہ نے اگر کوئی رخصت دی ہے تو اسے اللہ کا صدقہ سمجھنا چاہیے۔ ایک موقع پر سیدنا عمر کے سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ توجہ دلائی کہ اللہ کی رخصتوں کو حقیر سمجھنا درست نہیں ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے حالات سے واقف ہے۔ یہ رخصت غیر محتاط مشقت میں دی جاتی ہے۔ عام حالات میں، ظاہر ہے کہ آپ کوئی عبادت کریں گے، پڑھیں گے، کاروبار کریں گے، ہر جگہ مشقت ہوتی ہے، لیکن یہ وہ مشقت ہے جو انسان اٹھانے کا عادی ہوتا ہے؛ مشقت جب اس درجے میں داخل ہوتی ہے کہ جس کا تحمل مشکل ہوتا ہے تو وہاں غیر محتاط مشقت کے معاملے میں اللہ نے عبادات میں رخصت دی ہے اور اس کو بیان فرمایا ہے کہ اللہ اپنی عبادات کے معاملے میں تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کرے (البقرہ ۲: ۱۸۵)۔

اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ سہولت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ اللہ کی دی ہوئی رخصت ہے۔ یہ رخصت ان معاملات میں دی گئی ہے جن میں غیر محتاط مشقت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ غیر محتاط مشقت کہاں پیدا ہوئی اور کہاں نہیں ہوئی، اس کا فیصلہ ہر انسان نے کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں سفر میں روزہ چھوڑوں گا تو میں ہی فیصلہ کروں گا کہ سفر کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے روزہ چھوڑ دینا چاہیے، اللہ نے تو رخصت دے دی۔ بیماری میں بھی یہی معاملہ ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو معمولی سا سر درد ہو رہا ہو، لیکن وہ خیال کرے کہ اگر میں چائے چھوڑ دوں تو مجھے سر درد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جن کے بارے میں ایک شخص فیصلہ کرتا ہے کہ کیا فی الواقع میرے ساتھ

وہ معاملہ ہو گیا ہے کہ جس میں میں مرض کی اس کیفیت میں روزہ نہیں رکھ سکتا۔ اس فیصلے میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی ہے، لیکن جو اصول ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا، رخصت خود دے دی، اس کی وجہ خود بیان فرما دی، اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصویب کر دی اور ان رخصتوں کو اپنا صدقہ قرار دیا، اس لیے ان کے بارے میں یہ رویہ درست نہیں ہے کہ انھیں ترک کر کے خود کو مشقت میں ڈالا جائے۔[۴]

سحری کے بغیر روزے کا حکم

سوال: کیا سحری کھائے بغیر روزہ رکھا جا سکتا ہے؟

جواب: سحری کھائے بغیر روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ سحری کھانا ضروری نہیں ہے، مگر سحری کھانے میں بڑی برکت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے:

تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً. (بخاری، رقم ۱۹۲۳)

”سحری کیا کرو، اس لیے کہ سحری کرنے میں بڑی برکت ہے۔“

اسی سے رمضان کا حسن آپ کے شب و روز میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ ایک خاص وقت میں اٹھتے ہیں اور یہ وقت بھی بہت غیر معمولی ہے۔ یہ وقت اصل میں تہجد کا وقت ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ بھی آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدا آتی ہے کہ میرا کون سا بندہ ہے جو اس وقت اٹھے اور میری عبادت کرے اور میرے سامنے بندگی کے آداب بجا لائے، میں اس وقت اس کو دینے کے لیے آیا ہوں، لہٰذا یہ بہت غیر معمولی وقت ہے۔ رمضان میں بھی لوگ اسے سو کر گزار دیں تو پھر رمضان کا مقصد کیا ہے۔

چنانچہ سحری کے لیے اہتمام کے ساتھ اٹھنا چاہیے اور سحری کرنی چاہیے، تاہم اگر کوئی شخص سحری نہیں کر رہا تو روزہ ہو جائے گا۔ روزے کا مطلب یہ ہے کہ آپ فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک، یعنی غروب آفتاب تک کچھ کھائیں پئیں گے نہیں اور بیوی کے ساتھ کوئی جنسی تعلق قائم نہیں کریں گے۔[۵]

۴-https://ghamidi.com/videos/is-it-a-shariah-ruling-to-not-fast-in-difficult-situations-6325

۵-https://ghamidi.com/videos/can-a-fast-be-observed-without-eating-at-sehri-3021

چھوٹے بچوں کو روزہ رکھوانا

سوال: کیا چھوٹے بچوں کو روزہ رکھوانا ٹھیک ہے؟

جواب: بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کہ وہ روزے کی اہمیت کو سمجھیں، انھیں عادی بنانے اور شوق دلانے کے لیے روزہ رکھوانے میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اگر بچے کی صحت اور حالت وغیرہ دیکھ کر یا اچھے ڈاکٹر یا طبیب سے بھی مشورہ کر لیا جائے کہ کس عمر میں روزہ رکھوانا چاہیے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ طبی لحاظ سے جو موزوں عمر ہو کہ جس میں بچے کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، آپ اسے روزہ رکھوا سکتے ہیں۔ یہ سب چیزیں فرض ہونے سے پہلے اس لیے کی جاتی ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو اپنی معنوی میراث منتقل کرنا چاہتے ہیں؛ اپنا دین، اپنی روایات اور اپنی تہذیب سکھانا چاہتے ہیں۔

لہٰذا بچوں کے لیے تو ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ پہلے تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔ یہ تعلیم و تربیت کا روزہ ہے، فرض روزہ نہیں ہے۔[۶]

گھر والوں یا معاشرے کے دباؤ میں روزہ رکھنا

سوال: گھر والوں یا معاشرے کے دباؤ میں رکھے گئے روزے کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ہاں تو عبادات اسی وقت قابل قبول ہیں جب ان کے پیچھے تقویٰ ہوتا ہے۔ قربانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (الحج ۲۲: ۳۷)

”اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

یعنی آپ کے اندر تقویٰ، نیت، ارادہ تھا اور آپ نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے عبادت کی ہے تو اللہ کے ہاں اسی کا اجر ہے۔ گھر والوں یا معاشرے کے دباؤ میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی

۶-https://ghamidi.com/videos/is-it-okay-to-let-young-children-fast-6331

نہ کسی حد تک ان میں اس کے لیے رجحان پیدا ہو گا۔ دعوت کے لحاظ سے آپ نے کسی آدمی کو کہا کہ ذرا روزہ رکھ کر تو دیکھو۔ کوئی آدمی روزے سے ڈرا ہوا تھا کہ جب میں کھاؤں پیوں گا نہیں تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا، تو آپ نے اسے مشق کے لیے روزہ رکھنے کے لیے کہہ دیا تو یہ آپ کے حوالے سے تو ایک معقول بات ہو سکتی ہے، مگر اجر اسی عمل کا ملے گا جو اللہ کے لیے کیا جائے گا۔[۷]

اعتکاف کے آداب

سوال: اعتکاف کیا ہے اور اس کے آداب کیا ہیں؟

جواب: اعتکاف کوئی الگ عبادت نہیں ہے، یہ روزے ہی کا منتہاے کمال ہے۔ قرآن مجید میں روزے کے احکام ہی کی ذیل میں اعتکاف کا ذکر ہوا ہے۔ روزے میں کچھ جائز چیزوں، یعنی کھانے پینے اور بیوی کے ساتھ جنسی تعلق پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اعتکاف میں قانونی پہلو سے مزید دو پابندیاں عائد ہوتی ہیں: ایک یہ کہ رات کو بھی بیوی سے قربت نہیں کریں گے اور دوسرے یہ کہ مسجد میں رہیں گے۔ اعتکاف یہ ہے کہ آپ گھر سے اس کی نیت سے نکلیں، یہ فیصلہ کریں کہ کچھ وقت مسجد میں گزاریں گے اور اس سے باہر نہیں نکلیں گے، سوائے کسی ناگزیر ضرورت کے اور مسجد میں رہ کر آپ روزہ رکھیں گے۔ روزہ رکھنا فرض عبادت ہے، مگر اعتکاف ایک نفل عبادت ہے۔

روزے کو اس کے منتہاے کمال پر اختیار کرنا نفل اور تطوع ہے۔ قرآن مجید کی آیت 'وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ' (جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو) میں لفظ 'اعتکاف' پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسجد میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے تو گوشہ نشینی برائے گوشہ نشینی تو نہیں ہو سکتی، اس کے کچھ باطنی، فکری اور ظاہری مقاصد ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے آپ پر غور کریں، اپنے دین کی حقیقت کو سمجھیں اور اپنے پروردگار کے ساتھ اپنے تعلق پر غور کریں۔ یہ غور و فکر عبادت ہے۔ اب اس کا ایک ظاہری پہلو یہ ہے کہ آپ کو یہ موقع ملا ہے کہ آپ اس عرصے کے دوران میں زیادہ سے زیادہ نفل عبادت کر سکیں اور اللہ کی کتاب

۷-https://ghamidi.com/videos/what-is-the-status-of-fasts-kept-due-to-pressure-from-others-1919

قرآن مجید کو سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھیں۔

اگر آپ دین کے فہم کے لیے کچھ چیزیں مزید پڑھنا چاہتے ہیں تو وہ پڑھ لیں۔ جو معروف اور متعین عبادات ہیں، ان میں بنیادی چیزیں زیادہ اشتغال اور انہماک کے ساتھ مصروف رہنا اور اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے فہم میں اضافہ کرنا ہونی چاہییں۔

وہ چیزیں جو اعتکاف کی حالت میں اس کی روح کے خلاف ہیں، مثلاً کاروباری گفتگو، مجلسیں لگانا، میلے یا تقریب کی صورت پیدا کر دینا، جیسا کہ ہمارے ہاں ایک اجتماعی اعتکاف کا تصور پیدا ہو گیا ہے، ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس میں اصل مقصود یہ ہے کہ آپ مسجد میں بیٹھے ہوئے الگ ہوں اور مسجد کو اپنا مسکن بنا کر کچھ وقت گزاریں۔ آپ چند گھنٹوں کے لیے، دن بھر کے لیے یا تین دن کے لیے بیٹھیں، یہ آپ پر منحصر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس دن کے لیے بیٹھا کرتے تھے تو گویا یہ آپ کا اسوۂ حسنہ ہے، جسے لازم نہیں کیا گیا۔ یہ لازم نہیں کہ آپ دس دن کے لیے ہی بیٹھیں گے تو آپ کا اعتکاف ہو گا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح تہجد اہتمام کے ساتھ پڑھتے تھے، اسی طرح آپ اعتکاف بھی بہت التزام کے ساتھ کرتے تھے، یعنی ہمیشہ کرتے تھے، بلکہ ایک سال جب آپ کسی سفر یا اس طرح کی صورت حال کی وجہ سے اعتکاف نہیں کر سکے تو پھر اگلے سال آپ نے بیس دن اعتکاف کیا (ابوداؤد، رقم ۲۴۶۳)۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف دس دن کا ہے، ورنہ آپ کو جتنا موقع ملے، اتنا اعتکاف کر سکتے ہیں۔[۸]

شب قدر کو متعین نہ کرنے کی حکمت

سوال: شبِ قدر کو متعین نہ کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: جب کوئی چیز متعین کر دی جاتی ہے تو ساری توجہ اسی پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو متعین نہیں کیا۔ اس میں ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ بندے میں عبادت کا شوق اور اس کی تلاش کرنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اسے متعین نہ کرنے کی وجہ سے آپ آخری عشرے کی دس کی دس راتوں میں اور طاق راتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو گا اور اس کی عبادت کا ایک داعیہ پیدا ہو گا،

۸-https://ghamidi.com/videos/what-is-itikaaf-what-are-its-etiquettes-3000

جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ہوا۔ ان دونوں چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ملا دیا ہے، یعنی اطلاع بھی دے دی ہے اور اس اطلاع کو متعین بھی نہیں کیا، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر پورے رمضان میں عبادات کے داعیات پیدا ہو جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ ان کے لیے مغفرت اور رحمت کے مواقع ہوں۔

اس طریقے سے آپ ایک ہی رات میں سارا اہتمام خاص کر دیتے ہیں، اس لیے کہ ہم تعین سے نہیں جانتے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ پورے رمضان میں ہو اور ہو سکتا ہے کہ آخری عشرے میں ہو؛ آخری عشرے میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ لازماً اس میں آئی تھی، بلکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اس میں ہو۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد آ گیا ہے کہ غالباً آخری عشرہ تھا تو اسی پر ارتکاز ہو گیا۔ اس میں بھی یہ متعین نہیں کیا گیا کہ کون سی رات تھی؛ شاید طاق راتوں میں سے تھی۔ اس طریقے سے پانچ سات راتیں ایسی آ جاتی ہیں جن میں آپ عبادت بھی کرتے ہیں، اللہ کی طرف رجوع بھی کرتے ہیں اور مغفرت بھی چاہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو متعین نہ کرنے میں یہ بڑی حکمت ہے۔

اس رات کو اگر متعین کر دیا جاتا تو اس سے مزید بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے کہ یہاں پاکستان میں کب آئے گی اور عرب میں کب آئے گی، اس وجہ سے اس کو متعین ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ بالکل فطرت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ آپ کو اس کی اطلاع دے دی گئی ہے، لہٰذا ایک بندۂ مومن ہونے کی حیثیت سے آپ کا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ اس کا ظہور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ردعمل سے ہو گیا۔

اب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ کو سامنے رکھ کر عبادت بھی کرتے ہیں، اسے تلاش بھی کرتے ہیں اور یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ سے زیادہ قریب بھی ہوں۔[۹]

صدقۂ فطر

سوال: صدقۂ فطر کیا ہے اور کیا اسے عید سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے؟

جواب: صدقۂ فطر اسی طرح لازم ہے، جس طرح روزے رکھنا لازم ہے۔ یہ مال کی زکوٰۃ ہے جو آپ

۹-https://ghamidi.com/videos/the-wisdom-behind-not-revealing-the-precise-date-of-night-of-destiny-lailatul-qadr-1962

دیتے ہیں، اس وجہ سے ہمارے ہاں جو قدیم اصطلاح ہے، وہ 'زکوٰۃ الفطر' ہے، گویا یہ روزے کی زکوٰۃ ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ روزے کے اندر کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں، اس میں نشیب و فراز آجاتے ہیں، طبیعت و کیفیات میں فرق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے گویا اس کے لیے ایک زکوٰۃ مقرر کر دی ہے۔

اس کو 'صدقۂ فطر' کہا جاتا ہے اور یہ لازم ہے۔ عام حالات میں ہم جو زکوٰۃ دیتے ہیں، اس کا تعلق آمدنی یا مال یا پیداوار سے ہے، صدقۂ فطر کا تعلق افراد سے ہے، یعنی یہ تو بچہ بھی ہوگا تو اس پر عائد ہو جائے گا۔ عید کے تہوار پر یہ آپ کے لیے پاکیزگی اور دوسروں کے لیے مدد کا ذریعہ ہے۔ یہ عید کی نماز سے پہلے ادا کرنا چاہیے۔"[۱۰]

عید الفطر کا مقصد

سوال: ماہِ رمضان کے روزوں کے بعد عید الفطر کا مقصد کیا ہے؟

جواب: اس کے نام 'عید الفطر' ہی سے اس کا مقصد واضح ہے، یعنی بندے کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ وہ اس کی اطاعت کا مظاہرہ کرے اور اطاعت کا مظاہرہ اس درجے میں جا کر کرے کہ جب ساری جبلتیں زور کر رہی ہوں، اس وقت بھی وہ اللہ کے حکم پر اپنے منہ اور جبلتوں پر تالا لگا کر رکھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو قبول فرمایا، یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور مہینا پورا ہو گیا تو اب ایک تہوار مقرر کر دیا گیا تاکہ بندے اللہ کا شکر ادا کریں۔ چنانچہ قرآن مجید نے خود یہ بیان کر دیا ہے کہ یہ تہوار کیوں مقرر کیا گیا ہے:

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ. (الحج ۲۲: ۳۷)

"تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔"

یعنی قرآن جیسی کتاب دے دی، روزوں جیسی عبادت لازم کر دی اور اس سے گزرنے کی توفیق دی تو یہ ساری چیزیں شکر گزاری کا تقاضا کرتی ہیں کہ اللہ کی کبریائی بیان کی جائے اور اس کی تکبیر بلند کی جائے۔"[۱۱]

۱۰-https://ghamidi.com/videos/is-it-mandatory-to-pay-fitrana-before-eid-ul-fitr-2425

۱۱-https://ghamidi.com/videos/ramadhan-spring-season-of-performing-good-deeds-3046

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۸)

اصل مسئلہ: آخرت کی نجات

اصل مسئلہ آخرت کی نجات ہے، یہ بات ہر وقت امین احسن کے پیش نظر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرتے تھے۔ ۶/ اگست ۱۹۷۰ء کو لاہور سے جناب محمود احمد لودھی کے نام خط میں امین احسن لکھتے ہیں:

"میری صحت ادھر برابر خراب رہی اس وجہ سے تقریباً دو ہفتے سے لکھنے کا کام بالکل بند ہے۔ درس کا کام کچھ ہو رہا ہے۔

آپ حضرات سے امیدیں تو بہت کچھ تھیں لیکن شکایت الحمد للہ کوئی نہیں ہے۔ آپ اپنے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ میں یہ گمان نہیں کر سکتا کہ آپ حالات کے مساعد ہونے کے باوجود میری امیدوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ اب تو میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ اپنے سے بن سکے وہ کرو اور مستقبل کا معاملہ اللہ پر چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو کام جاری رہے گا نہ منظور ہو گا تو بند ہو جائے گا۔

میری صحت ادھر برابر خراب رہی اور اب بظاہر یہ تقاضائے عمر ہے۔ میرے سامنے اب اصل مسئلہ کاموں کی تکمیل کا نہیں بلکہ آخرت کی نجات کا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرتے دم تک کچھ خدمت انجام پاتی رہے۔ درس بھی کسی بڑی توقع کے ساتھ نہیں بلکہ محض ادائے فرض کے لیے دے رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ کسی نہ کسی شکل میں آخر دم تک جاری رہے۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۴-۳۵)

نفاست پسندی

نفاست امین احسن کی شخصیت کا لازمی حصہ تھا۔ یہ خوبی ان کے لباس ہی میں نہیں، بلکہ ماحول میں بھی نمایاں ہوتی تھی۔ ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پر کشش، وجیہ و شکیل، جامہ زیب، بارعب اور نفاست پسند شخص تھے۔ انھیں صفائی بہت پسند تھی۔ کبھی ان کے جسم پر میلے کچیلے کپڑے نہیں دیکھے گئے۔ لباس سفید پہنتے تھے جس پر کہیں داغ دھبہ نہیں ہوتا تھا۔ لباس ہی کی طرح ان کا کمرا بھی چمکتا اور جگمگاتا رہتا تھا۔ ان کی پڑھنے لکھنے کی میز بہت مرتب اور صاف ہوتی۔ ان کی ہر ہر چیز سے حسن، نفاست اور سلیقہ مندی ظاہر ہوتی تھی اور کہیں سے بدذوقی اور بے ڈھنگے پن کا پتا نہیں چلتا تھا۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۴)

ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب نے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''ہم لاؤنج سے گزر کر جس کمرے میں آئے وہ غالباً مولانا ہی کا بیڈ روم تھا۔ سلیقے اور نفاست سے رکھی ہوئی اشیاء، صاف ستھرا ماحول اور اس میں اجلے اجلے مولانا امین احسن صاحب کا سراپا، قریب روایتی بزرگوں کی طرح پان کے اسباب دھرے ہوئے، وہ نقشہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۸)

جلال و جمال

امین احسن کو جب کسی شخص پر غصہ آتا تو وہ سخت الفاظ اور اسلوب میں اس کا اظہار کرتے۔ اور اگر انھیں احساس ہوتا کہ اس میں ان سے زیادتی ہو گئی ہے تو یہ جلال جمال میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''جب کسی پر غصہ آتا اور بہت برہم ہو جاتے تو بعض اوقات کچھ سخت سست اور ناگفتنی بھی کہہ جاتے لیکن جلد ہی ان کا غصہ فرو ہو جاتا۔ کسی سے کینہ کدورت نہ رکھتے۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۵)

غامدی صاحب امین احسن کی ناراضی کی کیفیت بیان کرتے ہیں:

''وہ اتنے سچے، اتنے بے لاگ اور اتنے دوٹوک تھے کہ مصلحت اندیشی کے پیمانے سے اسے خطرناک سمجھا جائے گا۔ جو کچھ کہنا چاہتے، بغیر کسی تردد کے کہہ دیتے۔ اپنے رفقا میں فکر و عمل کا کوئی تضاد کسی حال میں برداشت نہ کرتے۔ ان کی محبت بے پناہ تھی، مگر اخلاص کی گہرائی سے جس طرح یہ محبت چشمہ بن کر پھوٹتی تھی، اسی طرح رنج بھی ابل پڑتا تھا، تاہم دیکھنے والے دیکھتے کہ اس میں کسی بغض، کسی کینے اور کسی دشمنی کا کوئی

شائبہ نہ ہوتا۔ گویا وہی معاملہ تھا کہ:

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق"

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۷)

عجز وانکساری

جماعت اسلامی کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کو امیر جماعت کی شخصیت سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کے نزدیک جماعت کے مقاصد کے لحاظ سے امیر جماعت کو نہایت عبادت گزار اور متقی ہونا چاہیے تاکہ اس کی ذات سے سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جائے، مگر مولانا مودودی ان کے معیار تقویٰ پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اس لیے وہ جماعت سے الگ ہو گئے۔ اس معاملے میں انھوں نے امین احسن کو بھی اعتماد میں لیا تھا، مگر وہ ان کی توقع کے برخلاف جماعت ہی میں رہے۔ امین احسن نے انھیں کہا کہ آپ حضرات تقویٰ اور عزیمت کے جس مقام پر ہیں، آپ کا امیر جماعت کی شخصیت پر اطمینان نہ ہونا سمجھ میں آتا ہے، لیکن میں تو مولانا مودودی سے بھی گیا گزرا ہوں، میں اس چیز کو جماعت سے علیحدگی کی بنیاد نہیں بنا سکتا۔ یہ واقعہ امین احسن کے عجز وانکساری کا غماز ہے۔

جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ لکھتے ہیں:

"فیلڈ مارشل ایوب خان اور مس فاطمہ جناح کے مابین صدارتی انتخاب کے دوران جماعت اسلامی نے حضرت مولانا مودودی کی منظوری سے فیلڈ مارشل کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ اس میں چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم بھی ان کے ہم خیال تھے۔ اس کے برعکس مولانا اصلاحی عورت کی سربراہی کی شرعی ممانعت کے قائل تھے۔ چوہدری محمد علی نے اپنے متعدد بیانات اور تقاریر میں فیلڈ مارشل پر سخت تنقید کرتے ہوئے مس فاطمہ جناح کی حمایت میں دلائل دیے، جس سے مولانا اصلاحی کو شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے چوہدری محمد علی کے خلاف سخت تنقیدی بیان دیا جس سے چوہدری صاحب کی تنقیص و تحقیر کا پہلو نمایاں تھا۔ معلوم ہوتا ہے بعد میں حضرت مولانا کو چوہدری صاحب کے جذبات مجروح ہونے کا خیال آیا۔ چنانچہ وہ بہ نفس نفیس چوہدری صاحب کی خدمت میں تشریف لے گئے، ان سے معذرت بھی کی اور ان کی خدمت میں "تدبر قرآن" کی پہلی جلد بھی پیش کی۔ اس ملاقات میں احقر کو بھی معیت کا شرف حاصل تھا۔ چوہدری صاحب مرحوم مجھ سے بھی ناراض تھے مگر بکمال شفقت صفائی قلب کا اظہار فرمایا۔"

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۸۳)

تفریح طبع

تفریح ہر انسان کی ضرورت ہے اور ہر انسان کسی نہ کسی ذریعے سے اور کوئی نہ کوئی تفریح حاصل کرتا بھی ہے۔امین احسن کی تفریح کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

”... علم و عمل کے جس مرتبے پر وہ فائز تھے، وہاں کھیل تماشے کا کیا گزر؟ لیکن ملک سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ پاکستان اور بھارت اگر کبھی میدان میں اترتے تو بار بار پوچھتے اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے، جب تک پاکستان کی فتح کا یقین نہ ہو جاتا۔ غالب، اقبال اور شبلی کے بڑے مداح تھے۔ ان کے اشعار اکثر پڑھتے۔“(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۸)

آم اور سینے پر تیر

لاہور سے ۷/ مئی ۱۹۶۶ء کو جناب محمود احمد لودھی کے نام امین احسن ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بچوں کی وجہ سے مصروفیتوں میں بھی کچھ اضافہ ہوا ہے۔ سعید کی واپسی دسمبر سے پہلے متوقع نہیں ہے۔ آموں کا ذکر کر کے آپ نے سینے پر ایک تیر مارا لیکن اب میں آموں سے دور ہو چکا۔ اب یہ نعمت میرے نصیب میں کہاں!“(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۱)

ڈھاکہ دیکھنے کی خواہش

لاہور سے ۶/ جون ۱۹۶۶ء کو محمود احمد لودھی صاحب کو خط میں امین احسن مرطوب علاقے کے ساتھ اپنی مناسبت کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

”ڈھاکہ دیکھنے کی خواہش تو کبھی کبھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔ میں طبعی طور پر اس طرح کے علاقوں سے بڑی مناسبت رکھتا ہوں جو مرطوب ہیں لیکن اب ہوس سیر و تماشا کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب تو ہر وقت بس فکر یہ ہے کہ چالیس سال کی کاوش سے جو ذخیرہ جمع ہوا ہے اس کا کوئی حامل پیدا ہو کہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائے اور اس طرز پر فکر کا سلسلہ قائم رہے اب ہمارا کیا اعتبار!“(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۰)

عقل سے کام لینے والے

امین احسن تقلید سے بے زار تھے اور دلیل کی بنیاد پر آرا قائم کرتے تھے، اسی طرح وہ اپنی تحریروں کا مخاطب بھی عقل سے کام لینے والوں ہی کو بناتے تھے۔ ۱۶/ ستمبر ۱۹۶۴ء کو لاہور سے امین احسن سردار محمد

اجمل خان لغاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”عنایت نامہ موصول ہوا۔ میری خواہش ہے کہ آپ میری کتاب پر جو رائے بھی قائم کریں اپنی صواب دید پر قائم کریں۔ (کتاب سے اشارہ تفسیر تدبر قرآن کی طرف ہے جو اس وقت ماہنامہ میثاق میں شائع ہو رہی تھی۔ مدیر) اس سے مجھے اطمینان ہو گا۔ اگر دوسروں کی رائے کی روشنی میں آپ جیسے صاحب علم و فہم نے کوئی رائے بنائی تو اس سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ آپ ان لوگوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں جن کا طرز فکر تقلیدی ہے۔ ایسے لوگوں کی رایوں کا مجھے مطلق انتظار نہیں ہے۔ مجھے صرف ان لوگوں سے بحث ہے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ میں نے یہ چیز انھی لوگوں کے لئے لکھی ہے اور میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں ایسے ہی لوگوں کے لئے لکھتا ہوں۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷)

امور دنیا سے بے اعتنائی

امین احسن اپنے علمی کاموں میں اس قدر مستغرق رہتے کہ امور دنیا سے آپ سے آپ دور ہو جاتے تھے۔ صحافی اور کالم نگار جناب ارشاد احمد حقانی نے اس ضمن میں لکھا:

”... جیسا کہ علم و ادب کی دنیا کے اکابرین کے ساتھ بالعموم ہوتا ہے، مولانا اصلاحی اپنے میدان میں تو شہسوار تھے اور یکتا و لاجواب تھے، لیکن امورِ دنیا کے ساتھ معاملے میں ان کا انہماک نہ ہونے کے برابر تھا۔ انھیں کبھی اچھرہ سے شہر جانا ہوتا تو لازمی تھا کہ کوئی کارکن ان کے ساتھ جائے، تانگہ کرائے اور انہیں بٹھا کر واپس آئے۔ مولانا اصلاحی ماشاء اللہ بہت خوش شکل، خوش ذوق، خوش اطوار اور خوش کلام تھے اور ان کی مجلس میں بیٹھنا اور ان کے منہ سے جھڑتے ہوئے الفاظ کے پھول چننا اور دیکھنا ایک بہت بڑی سعادت کی بات ہوتی تھی۔“ (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۳۷)

ایک دیرینہ کم زوری

خط کتابت کے معاملے میں اپنی ایک کم زوری کا ذکر کرتے ہوئے لاہور سے ۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جناب محمود احمد لودھی کے نام ایک خط ہی میں امین احسن لکھتے ہیں:

”میرے معاملے میں آپ کو یہ قربانی ہمیشہ کرنی پڑے گی کہ آپ کو میری طرف سے جواب پائے بغیر خط لکھتے رہنا پڑے گا۔ میری یہ کم زوری ایک دیرینہ کم زوری ہے کہ میں عزیزوں اور دوستوں سے خط کا ہمیشہ متوقع رہا ہوں اور خود خط لکھنے میں پرلے درجے کا کاہل ہوں۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۹۱)

اپنی کتب کی رائلٹی لینا

بعض مذہبی شخصیات اپنے لیے ایسی چیزیں بھی ناجائز قرار دے دیتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ امین احسن اس معاملے میں بڑی متوازن جگہ پر کھڑے تھے۔ ۱۶/ ستمبر ۱۹۶۴ء کو لاہور سے وہ سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''رائلٹی کے متعلق اب تک کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ ویسے میں نے اس سے پہلے اپنی بعض کتابوں کی رائلٹی وصول کی ہے اور وہ کتابیں دینی واسلامی ہیں۔ میرے خیال میں اس کے عدم جواز تو درکنار اس کی کراہت کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے کسی ایسے قابل ذکر آدمی کا علم نہیں ہے جس نے اس کو خلافِ شرع قرار دیا ہو۔ یوں میری خواہش یہ ہے کہ اگر میرے پاس وسائل وذرائع موجود ہوتے تو میں اس کو خود اپنے اہتمام میں چھپواتا اور خریداروں کو معمولی منافع پر دیتا... میں اس بات کے لئے تیار ہوں کہ کوئی صاحب روپیہ دے دیں اور وہ منافع میں شریک ہو جائیں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷)

مظلوم مصنف

بعض لوگ امین احسن کی کتابوں کا ترجمہ ان کی اجازت کے بغیر ہی شائع کر دیتے تھے، مگر امین احسن اس چیز کا صحیح طریقے سے نوٹس نہیں لیتے تھے، اور اس ظلم کو برداشت کر لیتے تھے۔ لاہور سے ۸/ اپریل ۱۹۷۹ء کو ڈاکٹر عبد اللطیف خان کے نام وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ مولانا عبد الحسیب صاحب کو لکھ دیں کہ مولانا فراہیؒ کی عربی تصنیفات کا تعلق تمام تر دائرۂ حمیدیہ سے ہے۔ ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز مولانا بدر الدین صاحب ہیں۔ رہیں میری تالیفات تو دعوتِ دین کے عربی ترجمہ کی اجازت میں نے کرامت صاحب کو نہیں دی ہے اگر وہ ترجمہ کرا رہے ہیں تو وہ بطور خود کرا رہے ہیں۔ میں اپنی کتابوں کے معاملے میں شروع ہی سے ایک مظلوم مصنف ہوں اور اپنی اس مظلومیت پر راضی ہوں۔ مولانا عبد الحسیب صاحب کو سلام لکھ دیجئے اور اپنے ہاں ہم دونوں کی طرف سے سب کو دعا و سلام پہنچائیے۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۹-۴۰)

تجزیے اور محاکمے کا اسلوب

امین احسن کے تجزیے اور محاکمے کا اسلوب بڑا سخت، قطعی اور مدلل ہوتا تھا۔ ''جائزہ کمیٹی'' پر الزامات کے جواب میں مولانا مودودی کو جو خط انھوں نے لکھا ہے، اسے شام کے سفیر نے پڑھا تو اس پر اپنے قلم سے لکھ دیا:

''مولانا، آپ نے خط نہیں لکھا، قاضی کا فیصلہ لکھا ہے۔'' جماعت اسلامی پر مولانا منظور احمد نعمانی کی فرد قرار داد جرم کے جواب میں، مولانا مودودی کے نظریۂ حکمت عملی کے تجزیے اور عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرے میں ان کا یہی انداز تھا(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۳)۔

امین احسن کی زیارت اور صاحب مزار

امین احسن حد سے متجاوز مذہبی عقیدت سے بہت بے زار تھے۔ مدرس قرآن قاضی محمد کفایت اللہ ان کے اس وصف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...جب میں مولانا جعفر شاہ مرحوم کے توجہ دلانے پر آپ کے ہاں پہنچا تو علیک سلیک کے بعد آپ نے میری آمد کا سبب پوچھا، میں نے تعزیت اور زیارت کو اپنی آمد کا سبب بتایا۔ آپ نے فرمایا: تعزیت کے لیے آنے میں آپ نے بڑی تاخیر کر دی۔ تاہم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس آمد کو قبول کرے۔ البتہ آپ کا میرے ہاں زیارت کے لیے آنا کسی طرح بھی صحیح نہیں، کیونکہ نہ تو میں کوئی مزار ہوں، نہ ہی کسی صاحب مزار سے میرا کچھ تعلق ہے، اور نہ ہی میں اس حوالے سے مجاز بیعت ہوں کہ جس کی لوگ آکر زیارت کیا کریں۔ لہٰذا اس کے علاوہ آپ کی آمد کا کوئی سبب ہے تو وہ بتائیں ورنہ مناسب یہی ہے کہ آپ نہ اپنا وقت ضائع کریں اور نہ میرا۔''(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۵۲)

طرز تحریر

امین احسن کی تحریر ادبی خوبیوں کی حامل ہوتی تھی۔ ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''مولانا امین احسن صاحب کی رگ وپے میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صہبائے علم وادب رقص کر رہی تھی۔ اور وہ ان کے طرز تحریر کو اردو انشاء پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ ان کی تحریروں کی رعنائی، دل کشی اور دلآویزی کا یہی سبب ہے۔ لیکن اب ان کی پختگی اور مشاقی سے ان کا اپنا الگ اور جداگانہ رنگ و آہنگ بھی ہو گیا تھا، جس میں سادگی کے باوجود پرکاری ہوتی تھی۔ طبقۂ علما میں ایسی صاف، شستہ، سلیس، شگفتہ اور رواں اردو لکھنے والے کم ملیں گے۔ ان کو عربی لکھنے پر بھی قدرت تھی۔ ''الضیاء'' (لکھنؤ) میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے۔

مولانا کی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور تصنیفی زندگی کی بسم اللہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تشریح سے

ہوئی۔ پہلے ''حقیقت شرک''، لکھی۔ پھر ''حقیقت توحید۔''(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۱-۱۲)

صحافی اور کالم نگار جناب ارشاد احمد حقانی نے لکھا:

''... مولانا اصلاحی کو تحریر اور تقریر پر ایسی بے پناہ قدرت تھی کہ باید وشاید۔ مولانا مودودی سمیت جماعت میں خطابت کے میدان میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ مولانا کا ذہن انتہائی شارپ تھا اور بعض اوقات ان کی یہ غیر معمولی براقیِ ذہن ان کی تحریر اور تقریر میں بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتی تھی۔ مفسرِ قرآن تو ہمارے ہاں بہت ہوئے ہیں، لیکن عربیِ مبین پر جس قدر قدرت مولانا اصلاحی کو حاصل تھی بہت کم لوگ اس میں ان کے مدِ مقابل ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔''(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۳۶)

صحافی اور کالم نگار عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں:

''... مولانا مودودی کی اسلامی فکر میں حد درجہ جامعیت ہے۔ ان کی انشا میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کا انداز تحریر زیادہ سائنٹیفک ہے۔ مولانا اصلاحی کا امتیاز گہرائی اور گیرائی ہے۔ انھیں قرآنی علوم میں ایک خاص تخصص حاصل ہے۔ ان کی انشا بہت زوردار ہے۔ مولانا مودودی کی فصاحت کے مقابلے میں اس میں آپ کو زیادہ بلاغت نظر آئے گی۔ مولانا مودودی کھلے میدانوں کے شہسوار ہیں۔ مولانا اصلاحی باقاعدہ کوہ کنی کر کے عملی پیاس بجھاتے ہیں۔ وہ اسلام کے احیائی مفکر تھے۔ یہ آیات قرآنی پر تدبر کرنے والے محقق تھے۔ دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ تقلید و جمود کے اس دور میں اپنی اپنی جگہ اجتہادی صلاحیتیں رکھتے تھے۔''(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۴۶)

ادیب اور بے ادب

امین احسن بہر حال ایک انسان تھے۔ تحریر میں ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی تھیں۔ ان غلطیوں کی وجہ بتاتے ہوئے لاہور سے ۱۶/ فروری ۱۹۶۷ء کو محمود احمد لودھی صاحب کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے بالکل صحیح گرفت کی۔ خدا جانے استہزا اڑانا، کس طرح قلم سے نکل گیا۔ معلوم ہوتا ہے 'استہزا' اور 'اڑانے' میں کچھ فصل تھا اس وجہ سے قلم نے ناگواری محسوس نہیں کی۔ میں لکھتے وقت دماغ کو معنی پر مرکوز کر کے الفاظ کے معاملے کو یکسر قلم پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ادیبوں کی طرح الفاظ پر دھیان نہیں دیتا۔ اس سے بعض مرتبہ عجیب عجیب، بچوں کی سی غلطیاں کر جاتا ہوں۔ آپ لوگ ان چیزوں پر نگاہ رکھیں۔ میں ادیب تو مشہور ہونا نہیں چاہتا لیکن بے ادب کہلانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس وجہ سے میری تحریروں کی اصلاح کرنے کا آپ لوگوں کو نہ صرف حق ہے بلکہ اسے میری خاطر فرض بھی سمجھیے۔''(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۱)

پڑھے کم لکھے زیادہ

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں لوگ دوسروں پر تنقید کرنے میں بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ وہ دوسرے کی تحریر یا نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مناسب وقت صرف نہیں کرتے اور فوراً تنقیدی قلم اٹھا لیتے ہیں۔ لاہور رحمان آباد سے ۲۸ / مئی ۱۹۷۹ء کو ملک عبدالرشید عراقی کے نام امین احسن لکھتے ہیں:

”اس کتاب سے متعلق مجھے کسی کی تقریظ یا تنقید کا انتظار نہیں ہے۔ جن لوگوں کی رائے پر مجھے اطمینان ہے ان کی رائیں مجھے موصول ہو چکی ہیں اور وہ کافی ہیں۔ مجھے جو کچھ لکھنا تھا میں نے لکھ دیا اب لوگ جو چاہیں خامہ فرسائی کرتے رہیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ لوگ اس کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرتے لیکن اس کور ذوقی کے دور میں سمجھنے سے زیادہ لکھنے کا شوق ہے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۶)

کم بولنا اور کم لکھنا

دانا لوگ یہ تو سمجھاتے ہیں کہ کم بولنا چاہیے۔ قلت کلام سے کام لینا چاہیے، مگر اس جانب بہت کم لوگوں کی توجہ جاتی ہے کہ کم لکھنا بھی چاہیے۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور وہ بڑے فخر کے ساتھ ان کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ تفسیر قرآن اور گنتی کی چند کتب کے مصنف امین احسن شیخ سلطان احمد صاحب کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

”اس معاملے میں آپ حضرات کا زیادہ حساس ہونا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ چیز آدمی کے لیے فتنہ ہے تو ہم گناہ گار تو اس فتنہ میں اس طرح مبتلا ہیں کہ اس سے نجات کی کوئی شکل باقی ہی نہیں رہی ہے۔ چاہیں یا نہ چاہیں لیکن چھپنے چھپانے سے اپنے کو بچانا ناممکن ہے۔ میرے نزدیک تو بولنا اور لکھنا دونوں یکساں ہے۔ جس طرح بے ضرورت بولنا گناہ ہے اسی طرح بے ضرورت لکھنا اور چھاپنا بھی گناہ ہے۔ اور اسی اصول پر جس طرح ضرورت پر نہ بولنا گناہ ہے اسی طرح ضرورت پر نہ لکھنا بھی گناہ ہے۔ میرے نزدیک یہ نقطۂ نظر زیادہ صحیح ہے۔ اور آپ حضرات کی شدت احتیاط میں صوفیانہ تقشف کی جھلک ہے جو بجائے خود ایک فتنہ ہے۔“

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۷)

[باقی]

Monthly
ISHRAQ
Lahore

March 2025
Vol.37 No.3
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ’’اشراق‘‘ کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ’’اشراق‘‘ کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ’’اشراق‘‘ کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ وتفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم وتحقیق